بستی کا آخری آدمی
نعیم آروی
ANWAR SAMI

بستی کا آخری آدمی

بستی کا آخری آدمی

نعیم آروی کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ

پاکستانی ادب پبلیکیشنز کراچی

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے
میری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے

نہ اتنی تیز چلے ، سرپھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتہ دکھائی دیتا ہے

یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے

شکیب جلالی

انتساب

شاعر' صحافی' دانشور' سیاست داں اور مزدور رہنما سید شبیر حیدر پیکر نقوی جانے اور کیا کیا تھے 'مگر اخباری دنیا میں پیرجی کے نام سے مشہور تھے۔ زندگی بھر سچ بولتے اور لکھتے رہے اور سزا کے طور پر اپنا دامن کانٹوں سے بھرتے رہے۔ بستر مرگ پر بھی موت کی آنکھوں میں زندگی کی تلاش جاری رکھی اور اپنا رخ کھڑکی کی جانب کئے رکھا جہاں سے روشنی کی کرنیں ان کا منہ دھوتی رہیں.
عزم و ہمت اور خلوص و محبت کے پیکر تھے ہمارے پیکر نقوی۔

نام کتاب　بستی کا آخری آدمی

مصنف　نعیم آروی

سال اشاعت　۱۹۹۱ء

سرورق　انور سمیع

ناشر　پاکستانی ادب پبلی کیشنز، ۲۱۳ پینوراما سینٹر صدر کراچی

لیزر کمپوزنگ　کوئیک لائنز، ۱۵ پریس چیمبرز آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

قیمت　۵۰ روپے

فہرست

کنفیشن ۱۵
نعیم آروی ـــ جدید ترقی پسند افسانہ کا نیا موڑ ۱۹
نعیم آروی ـــ جدید افسانہ اور حقیقت نگاری ۲۳
بستی کا آخری آدمی ۲۹
گڑیا کا قتل ۳۳
واپسی ۳۷
جنگل ۴۳
وہ لمحہ ۵۱
اتھارٹی ۵۷
دو حصوں میں بٹا جسم ۶۳
میت گاڑی کا ڈرائیور "الف" ۶۹
گمشدہ جزیرہ ۷۵

انتخاب

روزن ۸۵
بندی گھر ۸۹
سوا نیزے کا سورج ۹۹
بصارت ۱۰۳
مٹی ۱۱۳

☆

CONFESSION

کوئی تخلیق کار خود کو عصری تقاضوں اور ان سیاسی و معاشی عوامل سے جو سماجی زندگی میں حیران کن تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں ISOLATE نہیں رکھ سکتا۔ جو لوگ اس حقیقت سے آنکھیں موند کر خالص ادب تخلیق کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ جھوٹ کے سوا کچھ نہیں لکھتے ۔ عصری مسائل کے ادراک کے بغیر جو 'ادب لکھا جاتا ہے'۔ وہ فرد کا نوحہ تو ہو سکتا ہے ' مجموعی سماجی زندگی کا آئینہ دار نہیں۔ یہ میرا 'ایمان 'عقیدہ اور کمٹمنٹ ہے۔

پچھلی دو دہائیوں سے عالمی اور سیاسی خد و خال میں جو تبدیلیاں آئی ہیں وہ ابھی نامکمل اور تشنہ ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے پاس ستم رسیدہ انسانیت کے بہت سارے سوالوں کا جواب بھی موجود نہیں۔ تاریخ انسانی ہر لحہ آگے کی جانب رواں رہتی ہے 'مگر فی الوقت محسوس یہی ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے مقام پر آکر ٹھہر گئی ہے جہاں ہر فرد دم بخود اور ہکابکا ہے۔ عدل و انصاف توازن اور مساوات پر مبنی سوسائٹی کی تعمیر کا خواب مایوسی میں تحلیل ہو رہا ہے۔ اور اس مایوسی نے ایک ایسے ہمہ گیر فرسٹریشن کو جنم دیا ہے جس میں قوموں کی برادری اور ان سے تعلق رکھنے والے افراد کے درمیان دشمنی اور مخاصمت کا زہر تیزی سے پھیل رہا ہے ' وہ انسانی رشتہ جسے مقدس کتابوں اور انقلابی فلسفیوں نے اعلیٰ وارفع قرار دیا کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ رہا ہے۔

آپ کے روبرو سچے دل سے یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے اور اپنے جیسے لاکھوں 'کروڑوں کم نصیب انسانوں کی زندگی میں انقلاب آفریں تبدیلی کا جو سحر انگیز خواب دیکھا تھا اس کے ٹوٹنے اور بکھرنے کے عمل سے کبیدہ اور شکستہ ہوں۔

لیکن میں نے ایک کام ضرور کیا اپنے ذاتی غم اور فرسٹریشن کو اپنی ذات کے گنبد کے صحرا سے باہر نکل کر "وبائی مرض" بننے نہیں دیا جیسا کہ جدیدیت کے دعویدار بطور فیشن کرتے ہیں وہ ذاتی مایوسی اور گمراہی کو اجتماعی مایوسی اور گمراہی میں منتقل کرنے کے عمل ہی کو "جدت پسندی" اور "تخلیقی ادب" کا نام دیتے ہیں۔ دکھی انسانیت کو مایوس کرنا ادب کا آدرش نہیں بلکہ قتل انسانیت کا مشن ہے۔

میں زہر کا پیالہ خود پی رہا ہوں۔ قطرہ قطرہ۔۔

مجھے کہنے دیجئے کہ ایک درد مند اور ایماندار ادیب کی حیثیت سے عالمی اور قومی تغیرات سے باخبر ہی نہیں رہا بلکہ اکتساب بھی کرتا رہا۔ شاید یہی بنیادی وجہ ہے کہ میری بیشتر کہانیوں کے پس منظر میں ان تبدیلیوں کا ادراک اور احساس 'شائستگی اور آہستہ روی کے ساتھ موجود ہے۔ "گڑیا کا قتل" ہو یا "بستی کا آخری آدمی۔" "اتھارٹی" ہو یا "واپسی"۔ ان میں اگر بالائی سطح پر نہ سہی 'زیریں تہہ میں ایک خاموش اور مہذب احتجاج کی گونج ضرور سنائی دے گی۔۔۔ میرے اندر یہ جذبہ ہر لحہ پوری قوت سے محرک رہا ہے کہ پاکستان میں جو بھی نظام قائم کیا جائے اسکی بنیاد جمہوری فیصلوں 'عدل و انصاف اور توازن پر رکھی جائے بصورت دیگر ہمیں تباہی کے غار میں گرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا اور پھر ہوگا یہ کہ ہم وحشت اور بربریت کے ایسے "جنگل" میں گم ہو جائیں گے جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہوگا۔

نجات کے راستہ کی تلاش بہر حال جاری رکھنی ہوگی 'یہ ذمہ داری ان ادیبوں اور دانشوروں پر زیادہ عائد ہوتی ہے جو خود کو حالات اور حقائق سے منسلک اور باخبر رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

دو پیش لفظوں کی بدعت شوق میں نہیں مجبوری میں سرزد ہوئی ہے۔ جناب محمد علی صدیقی (ARIEL) اور ڈاکٹر فہیم اعظمی کا ممنون ہوں۔

مجاہد بریلوی 'میرے ہمدرد دوست ہی نہیں 'خسارہ کا سودا کرنے والے مجاہد بھی ہیں۔ ٹھہرا ہوا سورج 'کے بعد بستی کا آخری آدمی کی اشاعت کا بیڑہ بھی اٹھالیا۔ کتاب کے سرورق کے خالق جناب انور سمیع اور جناب غفار رحمانی کا بھی سپاس گذار ہوں جن کا تعاون مجھے حاصل رہا۔

میں اپنے ان چند دوستوں کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ شاید پھر موقع نہ مل سکے '

کچھ ایسا ہی SENSE کر رہا ہوں' جن کی رفاقت تخلیقی سفر کے اس موڑ تک حاصل رہی۔ ان میں موسیٰ رضا' مشرف احمد' زیب اذکار حسین ، اسرار شاکی' فاضل جمیلی' اور توقیر چغتائی سرفہرست ہیں۔ ان رفیقوں نے نہ یہ کہ میرے تخلیقی سفر میں نئی جہتوں کی نشاندہی کی بلکہ شدید مایوسی اور کرب انگیز لمحات میں مجھے زندہ رہنے کا حوصلہ بھی دیا۔

ایک آخری بات' میں نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اس پر نہ قناعت ہے نہ اطمینان۔ بہت مختصر اور معمولی اثاثہ ہے۔ ادھر تلخی ایام کا زہر میرے رگ وپے میں تیزی سے پھیل رہا ہے' اس لئے اللہ میاں سے مزید چند سالوں کی مہلت مانگتا ہوں۔

نعیم آروی

کراچی ۲۰ رمارچ

نعیم آروی... جدید ترقی پسند افسانہ کا نیا موڑ

محمد علی صدیقی

ترقی پسند افسانہ 'گزشتہ نصف صدی میں' متعدد مراحل سے گزر چکا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ عام لوگوں کی زندگی کے بارے میں قلم اٹھانا ہی ترقی پسندی کا سب سے بڑا مظہر تھا' بیسویں صدی کی اوائلی دہائیوں کی رومانیت پسندی کے خلاف رد عمل' ترقی پسندی کا بنیادی وصف ٹھہرا' ہر چند کہ رومانیت پسندی کا فروغ بذات خود مغربی اثرات کے تحت ممکن ہو پایا تھا۔ یہ فروغ بذات خود جاگیر دارانہ اور زمیندارانہ معاشرہ کی سماجی رجعت پسندی کے خلاف صدائے احتجاج تھا۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کے وجود میں آنے کے بعد سامراج دشمنی کی مذہبی مخالفت کی جگہ سائنسی طرز فکر اور اشتراکی معاشرہ کی جانب نظریاتی طور پر مضبوط فکری گرفت کا دور شروع ہوا اور پریم چند جیسے گاندھی واد کو بھی یہ نعرہ مستانہ لگانا پڑا کہ "ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔"

حسن کے معیار کی تبدیلی کوئی آسان بات نہ تھی۔ حسن کے معیار کی تبدیلی سے عام لوگوں کے ذہنوں میں صدیوں سے جاگزیں مابعد الطبیعات کی تبدیلی بھی ناگزیر ہوتی چلی گئی۔ معتقدات اور سماجی' ثقافتی' سیاسی اور ادبی رویئے بھی تبدیل ہونا شروع ہو گئے۔ کہانی اور افسانہ کے فرق پر بھی بحث و تمحیص شروع ہوئی۔

ترقی پسند افسانہ نگار مشاہدہ اور مجاہدہ دونوں کا قائل نظر آتا تھا۔ انگریزی سامراج کے خلاف جنگ آزادی کے دنوں میں بسا اوقات مشاہدہ بھی نظریاتی عینک کے رنگ میں رنگا گیا

اور مجاہدہ میں تلوار کی کاٹ تو آگئی لیکن بدلتی ہوئی حقیقتوں کی تفہیم کے لئے جس قدر خلوص' گہرائی اور وسعت قلب و ذہن درکار تھی وہ بہت کم افسانہ نگاروں کو میسر آئی' لیکن ایک ایسے دور میں جب افسانے کے قارئین کو حقیقی زندگی کے "رموز" کی نشاندہی بلا خوف و خطر ہو رہی تھی بہت کم افسانہ نگار نظریہ اور فن کے خوبصورت ملاپ پر قادر ہو سکے' کسی کے یہاں نظریہ کی فراوانی ہی فراوانی ہے اور فنی بالیدگی مفقود الخبر ہے اور کسی کے یہاں فنی بالیدگی پر ضرورت سے زیادہ زور ملتا ہے اور زندگی فٹ نوٹ کے انداز کی وضاحت چاہتی ہے۔ قیام پاکستان کے گیارہ سال بعد ہی جمہوریت اور آمریت کے درمیان آنکھ مچولی کا باقاعدہ کھیل اس دوران شروع ہوا' اس کھیل میں کہانی اور افسانہ کی بحث بھی الجھتی چلی گئی اور علامت نگاری صرف جدید افسانہ نگاروں سے عبارت نہ رہی' دائیں بازو کی آمریت میں بائیں بازو کے افسانہ نگار علامتوں کا سہارا لیتے ملتے ہیں اور نیم دلانہ بائیں بازو کی جمہوریت میں دائیں بازو کے افسانہ نگار علامتوں کا سہارا لیتے ہوئے پائے گئے۔ بیانیہ میں زیادہ تر کرداروں کے ذہن میں جھانکنا ضروری خیال کیا جاتا ہے اور افسانہ نگار اپنے کرداروں کے ذہنوں میں جاری و ساری کشمکش کو وجودیاتی طریقے سے Paint کرنے کی بجائے تبصرہ بازی پر اتر آتا ہے جس طرح کسی PuppetShow میں Puppets کی ڈور پکڑے ہوئے قصہ گو کا کردار بہت اہم ہو جاتا ہے۔

ترقی پسندانہ افسانہ' ماسوائے چند افسانوں کے زندگی کے میلہ میں ہونے والے Puppet Show کے قصہ گو کی قصہ گوئی بلکہ قصہ آفرینی سے عبارت رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ قصہ گو بہت کام کی بات کرتا ہے زندگی کے سربستہ رازوں پر سے پردا اٹھاتا ہے۔ وہ حقائق کا اس قدر موثر فوٹو گرافر ہو سکتا ہے کہ اسکی Lense کا ہر ہر زاویہ تخلیقی منہاج لئے ہو سکتا ہے کارش Karsh جیسا شہرہ آفاق فوٹو گرافر کسی بھی بڑے آرٹسٹ سے کس لحاظ سے کم قرار دیا جا سکتا ہے۔ فوٹو گرافی بہت مشکل فن ہے کہ اس میں روشنی اور سایہ کے مابین توازن سے محض شبیہ نہیں بلکہ شبیہ سے زیادہ آرٹ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ ایک سدھائی ہوئی "آنکھ" ایک اور سدھائی ہوئی "آنکھ" سے اس طرح ہمکلام ہوتی ہے کہ دائرہ احساسات کے نازک ترین تجربات فرد کی زندگی کے اندر جھانکنے کا ایک ایسا موقعہ فراہم کر دیتے ہیں کہ آرٹ کی ایک تعریف اس طرح بھی کی جا سکتی ہے کہ یہ انسانی زندگی کو ایک فرد کے ذاتی تجربے کی تعمیم کے

ذریعہ دوسروں کی زندگی کو زیادہ متمول بنانے کی طرف ایک قدم ہے، جس کا ایک بالغ آنکھ یا دماغ ہی زیادہ بہتر طور پر ادراک کر سکتا ہے۔

نعیم آروی کے افسانوں کا زیرِ نظر مجموعہ ان کی ادبی مسافت کا چوتھا سنگ میل ہے اور یہ مجموعہ اس لحاظ سے ایک اہم مجموعہ ہے کہ نعیم آروی نے زندگی کے برہنہ حقائق کو اپنی بے پایاں دلچسپی کا محور قرار دیا ہے۔ نعیم آروی تلخ حقائق ہی کی مدد سے ایک ایسی دروں بینی حاصل کر پائے ہیں جو خارج کی تمام ترسفاکیوں کو اس طرح دیکھ پانے کی ہمت رکھتی ہے کہ کہانی کار ہمیں دوسروں کی تلخ زندگی کا شریک و سہیم بنا کر الگ نہیں ہو جاتا جیسا کہ درجنوں ہم عصر افسانہ نگاروں کا خاصہ ہے، بلکہ وہ دوسروں کی زندگی کی "بدمزگی" اور "تلخی" کو اپنے قارئین کے لئے احساس و آگہی کی دولت بیدار بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے قاری کو اپنی دید و شنید میں کچھ اس طرح شامل کرتا ہے کہ وہ خود قاری کا تجربہ بنتا چلا جاتا ہے۔ نعیم آروی کے تازہ ترین مجموعہ کے بیشتر افسانے زندگی افروزی کے کاز کو ایک ضروری اور اہم فریضہ بناتے ہیں۔

ہرچند کہ اس مجموعہ میں شامل افسانہ "بستی کا آخری آدمی" نعیم آروی کا نمائندہ افسانہ نہیں ہے، لیکن یہ افسانہ بھی ترقی پسند افسانہ کے درمیانہ دور کی ادعایت کو فنی سطح پر قابل قبول بنا دیتا ہے۔ فن بذات خود مقصد کا بیری نہیں، لیکن فن اور مقصد پھوہڑ ہاتھوں میں ایک دوسرے کی نفی بن جاتے ہیں۔

"میت گاڑی کا ڈرائیور الف" بھی ایک تعجب خیز کلائمکس کی جانب بڑھتا ہوا افسانہ ہے، لیکن یہ ایک ایسی حقیقت کا عکاس ہے جو ہمارے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ فن، سرگوشی کی زبان پسند کرتا ہے۔ نعیم آروی بھی چپکے چپکے بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔

لیکن اسی مجموعے میں چار ایسے افسانے بھی شامل ہیں جن کا شمار موجودہ دور کے اچھے افسانوں میں کیا جا سکتا ہے۔ "دو حصوں میں بٹا ہوا جسم"، "واپسی"، "گمشدہ جزیرہ" اور "گڑیا کا قتل" یہ وہ افسانے ہیں جن میں نعیم آروی فنی لوازمات کی ناگزیریت کے چیلنج کو کسی خود شعوری کے بغیر قبول کرتا ہے اور پوری طرح کامیاب رہتا ہے۔

نعیم آروی کے افسانوں میں عام لوگوں کی زندگی میں گہری دلچسپی ملتی ہے۔ یہ دلچسپی، کسی بھی دور میں cliche کے ذیل میں نہیں آسکتی زندگی وہی ہے، جو عام لوگ گزارتے ہیں۔ عام لوگوں کی زندگیوں پر ہاتھ صاف کرنے والے استحصال پیشہ طبقہ کی زندگی "ایک چلتا پھرتا

lurlesque " ہے۔ ایک مزاحیہ سچویشن سے عبارت ہے اس کے پرائیویٹ اور پبلک رخ ہیں، یہ طبقاتی سطح پر تضادات کو راسخ کرتے ہوئے لوگوں کی زندگی ہے اور شخصی سطح پر وجودی طرز عمل سے قریب تر۔ ہے جن کے لئے انسان عقل کی حکمرانی کے بجائے عقل و شعور کی بیخ کنی کے لئے معرض وجود میں آیا ہے۔

نعیم آروی تا ہنوز 'انسانیت کے بظاہر لاینحل مسائل کی تفہیم کے لئے ایک ایسے اسلوب زیست کے طلبگار ہیں جو طاقتور طبقہ کو طاقتور تر بنانے کو اخلاقی طور پر ناقابل برداشت خیال کرتا ہے۔ وہ ایک ایسے حسن کے پجاری ہیں جس کی اساس ہر نوع کے مثالی تناسب کو انسانی زندگی کے لئے ضروری خیال کرتی ہے۔ ممکن ہے یہ خیال یا خواہش بعض حضرات کے لئے "دقیانوسی" ہو چکی ہو، لیکن ادب جہاں باشعور فکر و نظر کا طالب ہے وہاں وہ انسانی زندگی کی عادلانہ طور پر استواری کی ضرورت کا بھی قائل ہے۔ صرف یہی وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعہ زندگی کا مطالعہ ممکن ہے ورنہ اگر یہ پیمانہ دید شامل حال نہ ہو تو پھر نہ دید باقی رہتی ہے اور نہ دیدبان۔

نعیم آروی کی غیر صحافتی حقیقت نگاری

ڈاکٹر فہیم اعظمی

فلسفیوں نے عرفان حقیقت کو دو بنیادی نظریات میں تقسیم کیا ہے ایک حقیقت وہ ہے جس کا علم ہمیں بالواسطہ ہوتا ہے۔ یہ وہ خارجی حقیقتیں ہوتی ہیں جنہیں ہم سائنسی پروسس اور مختلف تصریحات (DATA) کے ذریعہ اخذ کرتے ہیں اور دوسری حقیقت وہ ہے جس کو ہم بدیہی پروسس INTUITIVE PROCESS ادراک PERCEPTION اور بصیرت کے ذریعہ جانتے ہیں پہلے کو CORRESPONDENCE اور دوسرے کو COHERENCE کہا گیا ہے۔ خارجی حقیقتوں کا بالواسطہ اظہار کرنے کے لئے یا ان سے متعارف ہونے کے لئے حوالہ جاتی زبان کی ضرورت ہوتی ہے لیکن COHERENCE یا بدیہی اظہار کے لئے ایسی زبان کی ضرورت ہے جس میں داخلیت اور جزئیات کا عنصر غالب ہوتا ہے اسی نظریہ کو ہم وسعت دیں تو صحافتی اور غیر صحافتی اسلوب اور طرز اظہار کا فرق معلوم ہوجائے گا۔ صحافتی اظہار خبروں کا اور ڈیٹا کا اظہار ہوتا ہے جس میں CORRESPONDECE کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ لیکن COHERENCE کا عنصر رکھنے والی زبان داخلیت اور تصور کی طرف مائل ہوتی ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ توفق TRANSCENDENCE یا روحانیت یا ماورائیت کی حامل ہوتی ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ حقیقت کو اس طرح بیان نہیں کرتی جیسے ایک صحافی کرتا ہے حقیقت نگاری میں جہاں جہاں داخلی' بدیہی یا جمالیاتی عنصر کی چاشنی ملتی ہے وہ اسی غیر صحافتی اسلوب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ نعیم آروی کی زیادہ تر کہانیاں REALISM یا حقیقت نگاری کی روایت کی آئینہ دار

ہیں ان کا اسلوب ان کہانیوں کو آرٹ سے بہت قریب لاتا ہے۔

یوں تو جدید کہانیاں بھی حقیقت ہی کی نمائندگی کرتی ہیں اور ان میں رومانیت کا عنصر نہیں ہوتا ان کہانیوں کے اسلوب میں شعوری رو، سریلزم، سمبل سبھی شامل ہوتے ہیں، اس لئے ان کہانیوں میں جمالیات کا عنصر غالب ہوتا ہے بالکل اسطرح جیسے کیمرے سے بنائی ہوئی تصویر حقیقت کی نمائندگی کرتی ہے لیکن ایک آرٹسٹ کی بنائی ہوئی تصویر اس کے داخلی تصورات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ کیمرے سے نکلنے والے نیگیٹو کو پھرسے پروسس کرکے جب تک اسے پازیٹو نہ بنایا جائے وہ بدصورت رہتا ہے۔ اب یہ کیمرہ مین کا کام ہے کہ وہ تصویر کس رخ سے لیتا ہے اور اسکو کس خوبصورتی سے پروسس کرتا ہے اس صورت گیری میں کیمرہ مین کے ہنر اور تیکنیک کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ ایک سرئیلی یا تجریدی آرٹسٹ داخلیت کا ترجمان ہوتا ہے اس کی تصویر یا پینٹنگ کو دیکھ کر حتمیٰ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کسی شخص یا مقام یا جگہ کی تصویر ہے اور یہی کثیرالمعنویت جدید کہانیوں کو حقیقت نگاری کے نظریہ کے تحت لکھی جانے والی کہانیوں سے الگ کرتی ہے نعیم آروی اپنے ماحول کی تصویر کشی میں ایک مشاق کیمرہ مین نظر آتے ہیں

نعیم آروی کی کہانیاں گڑیا کا قتل، جنگل، بستی کا آخری آدمی، گمشدہ جزیرہ ۔ اتھارٹی اور اس قسم کی دوسری کہانیاں زندگی میں بلکہ اس ماحول میں ہونے والے واقعات کا بیان ہیں جن میں تخلیق کار زندہ ہے۔ وہ ان واقعات کو دیکھتا ہے، سنتا ہے، ان کے متعلق پڑھتا ہے اور پھر ان واقعات کو اپنی زبان میں کہانی کے پیکر میں ڈھالتا ہے اور ان واقعات کو کہانی کے پیکر میں ڈھالتے وقت وہ ایک فن کار بن جاتا ہے۔ نعیم آروی کریفٹ اسٹوری لکھنے والوں کی طرح اپنی کہانی کو کسی بنے بنائے فریم میں فٹ نہیں کرتے بلکہ اپنے فنکارانہ اظہار کے ذریعہ اسے دھیرے دھیرے نمایاں کرتے ہیں اور آخر میں اسکا امپیکٹ بھرپور ہوتا ہے۔ حقیقت نگاری کے باوجود نعیم آروی اپنی کہانی میں کسی متحیر، تفکر، نظریہ یا چونکا دینے والے اختتام سے اسے عمودی نہیں بناتے بلکہ جدید کہانی کا افقی طرز بیان اپناتے ہیں۔ اس مجموعے کی ایک کہانی اتھارٹی ہے جس میں زندگی کے ایک عمومی اور روز مرہ کے واقعات سے وہ ایک فضا پیدا کرتے ہیں جس میں ایک ترقی پسند افسانہ نگار ہڑتال اور انقلاب زندہ باد کے نعرے سے کم پر اکتفانہ کرتا لیکن نعیم آروی ایک نہایت حقیقت پسندانہ رخ دے کر کہانی کو ایک خاموش

احتجاج کی کہانی بناتے ہیں اور سارتر کے قول کے مطابق فرد کی "نہیں" کہنے کی آزادی کو برقرار رکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسا افقی اسلوب ہے جو جدیدیت کی ترجمانی کرتا ہے۔

اپنی زیادہ تر کہانیوں کا خام مال خارجی واقعات سے حاصل کرنے کے باوجود نعیم آروی اپنی کچھ کہانیوں میں صرف ایک فرد بن جاتے ہیں اور وجودی فکر کے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ ان کہانیوں میں انکی داخلیت اور جذباتیت موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے انہیں ایک جدید کہانی کار بنادیتے ہیں۔

"اچھا تو اس نئی قبر میں جس کو اتارا گیا ہے وہ تم ہو......... اور تمہارے رشتہ دار جیسے سب کے رشتہ دار اپنے کندھوں کا بوجھ ہلکا کرکے چلے جاتے ہیں۔ تمہیں بھی تنہا چھوڑ کر چلے جائیں گے۔"

" ہاں جب سے میرا وجود دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا ہے .... ایک حصہ قبر کے اندر ہے .... دوسرا باہر...... ماتم کناں ....."

"موت کے گہرے سکوت اور زندگی کے شعور کے درمیان یہ فاصلہ تو باقی رہتا ہے ...."

"دو حصوں میں بٹا ہوا جسم"

لیکن ایسا لگتا ہے کہ نعیم آروی معاشرتی دباؤ اور حقیقت نگاری کے ذوق ابلاغ و وضاحت سے اپنے کو نہیں بچا سکے اور اپنے داخلی سفر میں عائشہ کو شامل کرلیا جسکے متعلق۔

"تیمار دار بہن نے بتایا تھا کہ بہت غریب لڑکی ہے۔ اس کی ماں اسے علاج کے لئے نواب شاہ سے لے کر آئی ہے اور اس نے خود کلفٹن میں کسی زردار کے بنگلے پر ماسی کا کام سنبھال لیا ہے۔"

اور کہانی کے ختم ہونے کے بعد قاری یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ کہانی میں وجودی فکر کو اہمیت دے یا عائشہ کی غربت اور خلوص کو۔

میت گاڑی کا ڈرائیور الف بھی اس مجموعے کی ایک کامیاب کہانی ہے جس میں فرد کے غم اور جذبات کو بڑا دخل ہے۔ یہ فرد کا نوحہ بھی ہے اور معاشرے کا مرثیہ بھی۔

"کیا کبھی آپ نے قریب سے کسی لاش کے چہرے کا نظارہ کیا ہے۔ کسی حادثہ کا

شکار انسانی چہرہ ، کٹی پھولی ہوئی ، دھندلی اور بے رونق آنکھیں .... میت گاڑی کے آخری پھیرے میں ہمیں کسی لڑکی کا صرف ایک بازو ملا ۔ جس کی سانولی سلونی کلائیوں میں کانچ کی ہری ہری چوڑیاں خون میں دھل کر سیاہ پڑ گئی تھیں ۔ میں نے کٹے ہوئے اس بازو کو لٹھے کے سفید کپڑے میں لپیٹ کر گاڑی میں ڈال دیا ....،،

،،بستی میں ہو کا عالم تھا درو دیوار پر خوف کے سائے منڈلا رہے تھے ۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو بیوی بدحواسی کے عالم میں چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئی اور بچے آہ و بکا کرنے لگے .... ہماری " ش " اسکول سے گھر واپس نہیں آئی ۔"

..... " میت گاڑی کا ڈرائیور الف "

نعیم آروی نے حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ علامتی کہانیاں بھی لکھی ہیں ، ان کی کہانیاں " واپسی " اور " وہ لمحہ " دونوں علامتی کہانیاں ہیں ۔ واپسی ایک ایسے عام واقعے کی کہانی ہے جسکا ہم سب کو تجربہ ہے ۔ ہم نے اکثر لوگوں کو پنجروں میں بند پرندوں کو خرید کر آزاد کرتے دیکھا ہے یہ عمل پرندے پکڑنے والوں کے لئے مادی مسرت کا ذریعہ اور آزاد کرنے والوں کے لئے روحانی حظ اور آخرت کی راحت کا ذریعہ ہے ۔ ساری کہانی بیانیہ معلوم ہوتی اور اس میں جگہ اور وقت کا تعین اسے خاص جمالیاتی عنصر کا حامل نہیں ہونے دیتا ۔ لیکن آخر میں یہ کہانی ایک نفسیاتی اور غیر معمولی حقیقت کی جانب اشارہ کرتی ہے ۔ دو خوبصورت طوطے جنہیں آزاد کردیا گیا تھا ۔ پنجرے میں واپس آجاتے ہیں ۔ مدتوں کی قید کے بعد کبھی کبھی آزادی کی حس ختم ہوجاتی ہے یا پھر بقول غالب

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

اور شاید ماحول کا خوف آزاد منش کو بھی گوشہ نشین ہونے پر مجبور کردیتا ہے ۔ کہانی میں ایک لطیف طنز ہے جو قفس سے کبھی نہ مانوس ہونے والے طوطوں کو بھی REFLEXACTION کے تابع کردیتا ہے کیا ہماری آزادی حاصل کرنے والی نسل کی نسل برسوں کے ظلم واستبداد کے دیو کی خیرہ کن روشنی برین واش ہوکر قفس کو ہمیشہ اپنائے گی اور آزادی اسے راس نہ آئے گی ! کون جانے ۔

" وہ لمحہ " ہمارے ملک کے گیارہ سالہ استبدادی دور کی کہانی ہے جب آزادی پسند عوام کو قید تنہائی میں رکھا گیا تھا ۔ حصول آزادی بڑی مشکل سے ممکن ہوا اور آزادی کے اس لمحے کی مسرت لازوال ہے باوصف اس کے کہ آئندہ آزادی سلب ہونے کا خطرہ موجود ہے ۔

کہیں کہیں نعیم آروی کے افسانوں میں انشائیہ کا رنگ نظر آتا ہے اور ان کے بہت سے جملے محض فکری اظہار اور STATEMENT معلوم ہوتے ہیں ۔ مثال کے طور پر " اتھارٹی " میں یہ جملہ :۔

"انسان متضاد خوبیوں کا مجموعہ ہے ۔ کبھی کبھی سب برداشت کرلیتا ہے اور کبھی معمولی بات مشکل سے برداشت کرپاتا ہے ..."

یہ جملہ کہانی کار کے خیالات کا حصہ ہے اس کو کردار سے کہلوایا جاتا ۔ یا شعوری رو یا خود کلامی کے طور پر کہانی کار خود کہتا تو یہ کہانی میں ضم ہو سکتا تھا ۔ موجودہ حالت میں یہ کہانی کے آرٹ کو مجروح کرتا ہے ۔

مجموعی طور پر نعیم آروی کی کہانیاں زندگی سے قریب ہیں ۔ یہ ماحول اور معاشرے کی 'اور فرد کے داخلی جذبات و محسوسات کی بھی ترجمانی کرتی ہیں 'نعیم آروی کا اسلوب ان کی کہنہ مشقی اور فکشنائزیشن کے ہنر کو ظاہر کرتا ہے مجموعے کی کہانیوں کا ابلاغ بھرپور ہے اور ہر کہانی میں قاری کو اپنی کہانی نظر آئے گی ۔ اپنے ماحول کی کہانی جس میں قاری سانس لے رہا ہے اور REALISM کی روایت میں لکھی جانے والی کہانیوں کی یہ بہت بڑی کامیابی ہے ۔

نعیم آروی کے طرز بیان نے زندگی کے حقیقی واقعات کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے ان کہانیوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ معاشرے اور ماحول کی برائیوں کو بیان کرتی ہیں مگر ان کا خالق انہیں کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بناتا اور نہ کہیں مصلح اور مبلغ کا روپ دھارتا ہے اس طرح یہ کہانیاں حقیقت نگاری کی حدود سے تجاوز کر کے جدیدیت کے قریب آجاتی ہیں ۔

مجھے امید ہے کہ نعیم آروی کی کہانیاں جن میں زندگی کی SLICES کو داخلی اسلوب سے تراش کر خوش ذائقہ بنایا گیا ہے 'قارئین کی توجہ کا مرکز بنتی رہیں گی ۔

بستی کا آخری آدمی

وہ ملگجے بال و پر سے بھرا ہوا پہلا مردار خور گدھ تھا جو اچانک آسمان کی مغربی بلندیوں سے نمودار ہوا۔ بالوں سے صاف 'لمبی' لچک دار گردن 'مضبوط بازو 'خونخوار چونچ 'چھوٹی چھوٹی سرخ اور کینہ توز آنکھیں۔ بلندی کے باوجود اس کی نگاہیں شکار پر انی کی طرح گڑی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے بھاری پروں کو مشاقی سے نیچے اوپر حرکت دیتا ہوا لق و دق ویرانے میں ا ستادہ ننگے پیڑ کی موٹی ٹہنی کے اوپر چکر لگاتا ہوا آہستگی سے بیٹھ گیا۔ اس کے پروں کے سمٹنے کے عمل سے اطراف میں ہوا کی تیز آسیب زدہ سرسراہٹ پھیل گئی۔ اس کا شکار اس جگہ سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ حریص اور بھوکا گدھ اپنی گردن کے تناؤ کو ذرا کم کر کے اب اس انتظار میں تھا کہ اس کے قبیلے کے دوسرے مردہ خور گدھ وہاں کب پہنچتے ہیں کیونکہ ان کے درمیان یہ سمجھوتہ موجود تھا کہ وہ کسی بھی مردار کا گوشت مل بانٹ کر کھائیں گے۔ ان میں کسی نے اس سمجھوتے کی آج تک خلاف ورزی نہیں کی۔ اپنی فطری کمینگی اور غیر معمولی حرص و ہوس کے زیر اثر ہونے کے باوجود ان کے درمیان یہ اصول آج تک برقرار تھا۔

لنج ٹہنی پر گردن نہوڑائے بیٹھے ہوئے سالار گدھ کو اپنے دوسرے مردہ خور ساتھیوں کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مغربی سمت کی نیالی اور بنجر پہاڑیوں سے ایک کے بعد دوسرا 'پھر تیسرا اور اس کے بعد مردہ خور گدھوں کے جھنڈ کے جھنڈ نمودار ہوتے گئے۔ زرد غبار میں لپٹی فضا میں ان کے ملگجے 'مضبوط پروں کے پھیلاؤ' پرواز میں تندی اور چکنی گردنوں کے تناؤ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ انہیں اس بات کی خبر لگ چکی تھی کہ زمین کے اس ویران

حصے پر آج پھر کوئی انسانی لاش ان کے انتظار میں ہے' بے یارومددگار' بے گوروکفن۔
کبھی زمین کے اس حصے پر آبادی ضرور رہی ہوگی' مگراب اس کے آثار بتدریج معدوم ہو چلے تھے۔ بستی کے بیشتر مکانات کھنڈرات میں تبدیل ہوچکے تھے۔ نالے' رہٹ اور کنویں خشک ہو کر مٹی سے بھر گئے تھے۔ ٹوٹی پھوٹی دکانوں کے مڑے تڑے دروازوں پر مکڑیوں نے گھنے جالے بن دیے تھے۔ لق و دق میدانوں میں جہاں کبھی لہلہاتے ہوئے کھیت اور کھلیان ہوں گے' اب وہاں ریت اور مٹی کے ٹیکروں کے درمیان ببول اور کیکر کے جھنڈ بہ کثرت اگ آئے تھے جو شام کے گہرے ہوتے ہوئے سائے اور رات کے سناٹے میں ڈراؤنے خواب کی طرح دکھائی دیتے۔

مردہ خور گدھوں کے قافلے فضا میں منڈلاتے ہوئے ایک ایک کر کے ٹنڈ منڈ درختوں کی زرد ٹہنیوں پر بیٹھتے گئے۔ ان کی طمع سے بھری کینہ توز نگاہیں انسان کی لاش کے پسندیدہ حصوں پر جمی ہوئی تھیں جو ذرا دیر پہلے بے بسی کے عالم میں انہیں دیکھتا ہوا آخری ہچکی کے ساتھ رخصت ہوا تھا۔ وہ اس اجاڑ اور غیر آباد بستی کا آخری آدمی تھا۔

آسمان کا مغربی افق صاف اور واضح ہوگیا تھا کیونکہ مردہ خور گدھوں کی آمد کا سلسلہ رک چکا تھا اور زمین کے اس غیر آباد ٹکڑے پر' جو کبھی آبادی کا سرگرم حصہ رہا ہوگا' گدھوں کی ٹولیاں لنج درختوں سے اتر اتر کر لاش کے گرد جمع ہونے لگی تھیں۔ ان کے غلیظ کھردرے اور بھاری پنجوں کے ناخن نوکیلے اور تیز تھے۔ وہاں کوئی شور و غوغا نہ تھا' البتہ سرخی مائل چھلکے جیسی گردنوں کے سرے پر نوکیلی چونچوں اور آنکھوں میں حریصانہ چمک اور وحشیانہ عجلت بڑھ گئی تھی۔ بے حس و حرکت انسانی جسم ان کی چیر پھاڑ اور نوچ کھسوٹ کے لئے بالکل تیار تھا۔ کسی قسم کی مزاحمت کی توقع نہ تھی۔ مزاحمت یا معمولی حرکت کے سبب انہیں چونچ مارنے میں خلل پڑنے کا خدشہ رہتا ہے۔ شاید اسی لئے گدھوں کی ٹولیاں لاش ٹھنڈی ہونے کا بے صبری سے انتظار کرتی ہیں۔

گدھوں کے لاش پر ٹوٹ پڑنے کا وقت قریب آچکا تھا۔ صرف ایک مسئلہ باقی رہ گیا تھا۔ پہلا گدھ جو سالار گدھ تھا' اور ان میں سب سے زیادہ نمایاں' توانا اور کینہ پرور نظر آرہا تھا' لاش کے پسندیدہ عضو پر چونچ مار کر دعوت کا آغاز کرتا۔ سارے گدھ اپنے پروں کا بھاری بوجھ سنبھالے پھدک پھدک کر لاش کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ وہ گردن گھما گھما کر سالار

گدھ کی پہل کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ سالار گدھ نے اپنے قریب ذرا کم جسامت کے دوسرے گدھ سے سوال کیا۔ "اس کے جسم پر زخموں کے وہ نشان دکھائی نہیں دیتے جو اس سے پہلے یہاں ملنے والی لاشوں پر پائے جاتے تھے۔" دوسرے مردہ خور گدھ نے اپنی لمبی گردن کو حرکت دیتے ہوئے مکاری سے جواب دیا۔

"جناب والا! یہ اس اجاڑ بستی کا آخری آدمی تھا۔ اس کو کسی نے قتل کر کے یہاں نہیں ڈالا ' بلکہ فاقوں سے نڈھال ہو کر مرا ہے ' اس لئے اس کے جسم پر زخموں کا کوئی نشان نہیں ہے۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا؟" تیسرے ' چوتھے ' پھر سارے مردہ خور گدھوں نے بیک وقت سوال کیا۔ ان میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔

مسئلہ گمبھیر تھا ' بستی کے اس آخری آدمی کے بعد انہیں مردہ انسان کا گوشت کہاں ملے گا؟

سالار گدھ لمحہ بھر کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے بے خیالی میں انسانی گوشت کی لذت اور خون کے دھبوں سے بھری ہوئی طاقتور چونچ لاش کے فاقہ سے پچکے ہوئے پیٹ پر رگڑتے ہوئے جواب دیا۔

"خیر ' فکر کی کوئی بات نہیں ' یہاں سے چند کوس کے فاصلے پر ایک دوسری انسانی بستی موجود ہے جہاں ہمارے پروں کا سیاہ سایہ پڑ چکا ہے۔ میری بات ذرا غور سے سنو ' جب تک ان میں ہمارا وجود برقرار ہے ہم فاقوں سے کبھی نہیں مریں گے۔"

یہ کہتے ہوئے سالار گدھ نے لاش کے قلب میں اپنی تیز اور آلودہ چونچ گاڑ دی۔ اس کے ساتھ ہی سارے مردہ خور گدھ انسانی لاش پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے۔

گڑیا کا قتل

کبھی کبھی کوئی واقعہ اہم ہونے کے باوجود اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنا دلگداز اور ناگہانی ہوتا ہے کہ اسے دوسروں کے سامنے بیان کرنے میں بڑی دشواری اور الجھن محسوس ہوتی ہے۔ پھر یہ مسئلہ بھی ہوتا ہے کہ آیا وہ واقعہ اس مرتبہ کا ہے بھی یا نہیں کہ اسے دوسروں کے سامنے بیان کیا جائے۔ چاہے وہ اپنے اندر انسانی المیہ کا کتنا دردناک پہلو کیوں نہ رکھتا ہو۔

چند روز پہلے کی بات ہے، میرے ساتھ بھی ایسا ہی متحیر کردینے والا واقعہ رونما ہوا جس کے بارے میں تاحال یہ فیصلہ نہیں کرپایا کہ اسے آپ کے سامنے رکھنا مناسب بھی ہوگا یا نہیں۔ میں خود بھی اس واقعہ کے "حیران کن حصار" سے ابھی تک باہر نہیں نکل پایا۔ نہ ہی کوئی حتمی فیصلہ کرپایا، لیکن اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ اس غیر معمولی اور غیر متوقع واقعہ کا ذکر آپ سے کروں اور پھر آپ سے دریافت کروں کہ آپ میری "ذہنی گمشدگی" کی اس کیفیت سے کس حد تک اتفاق کرتے ہیں. جس میں بار بار صرف ایک ہی سوال کی گھنٹی زور زور سے بج رہی ہے کہ اس گڑیا کو کس نے قتل کیا؟

دیکھئے، میں یہ سوال بڑی احتیاط اور ہر قسم کی ذمہ داری کے ساتھ کررہا ہوں، تاکہ آپ کا کوئی مناسب جواب مجھے تسلی دلا دے اور میں خود کو اس "جذب" (اس جگہ میں دوسروں کے مطابق جنون یا خبط بھی استعمال کرسکتا ہوں مگر میں جس ذہنی کیفیت سے دوچار ہوں اس کے لئے مجھے لفظ "جذب" زیادہ مناسب محسوس ہوتا ہے، اور غالباً.....نہیں بلکہ یقیناً آپ مجھے اس لفظ کے استعمال کے حق سے روک بھی نہیں سکتے) کے گہرے اور بسیط کنویں

سے باہر نکال سکوں' اور ہاں اگر آپ کوئی جواب دینے کی بجائے کسی ایجنسی کی سادہ وردی میں ملبوس فربہ جسم' خشمگیں آنکھوں اور بڑی بڑی مونچھوں والے کسی اجنبی کی طرح میری ٹوہ میں لگ گئے تو ممکن ہے کچھ لوگ ادھر ادھر کی ہانک دیں اور ان ہی میں کچھ ایسے بھی مل جائیں جو دبے دبے لفظوں میں اشارہ کریں۔

"چہ' چہ...... شاید اس واقعہ سے بیچارے کا دماغ چل گیا۔"

سنا آپ نے ـــــ "بیچارے کا دماغ چل گیا" یہ ہے ان کا سیدھا سادا جواب جس کا آپ کے پاس یقیناً کوئی مناسب جواب نہیں ہوگا۔ اور آپ گومگو کی حالت میں اپنا سر صرف ہلا کر رہ جائیں گے۔

میں بالعموم ایسی باتیں سنکر ہنستا نہیں .... ہنسنا ہمارے یہاں بڑی عیاشی ہے۔ مسکراتا بھی نہیں' کیونکہ یہ ذرا کم ڈگری کی عیاشی ہے مگر کبھی کبھار یہ کم درجہ کی عیاشی کر ڈالتا ہوں۔ سامنے کی بات ہے کیا ذہنی توازن کھو دینے والا کوئی شخص کسی واقعے پر اتنا غور و فکر کرسکتا ہے جتنا میں اکثر و بیشتر کرتا ہوں اور کیا کوئی خبطی کوئی بات ہوشمندوں کے سامنے بھی رکھتا ہے۔ یعنی میں اس ناگہانی حادثے کے بعد اب تک سرگرمی کے ساتھ سوال پر غور کر رہا ہوں کہ اس پیاری سی گڑیا کو کس نے قتل کیا؟ یا ان کھلونوں کا قاتل کون ہے؟ اور یہ کہ جب میں اس گتھی کو سلجھا نہیں پایا تو پھر آپ کے سامنے یہ سوال پیش کر رہا ہوں کہ آپ ہی میری کچھ مدد کریں۔

اب مجھ میں اتنی تاب نہیں کہ زیادہ دیر اس ناگہانی واقعے کو آپ سے چھپائے رکھوں۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی خدشہ ہے کہ کہیں آپ مجھے DEEP MENTAL SHOCK کا مریض قرار دے کر اس حادثے کے اس گہرے تاثر کو کم کرنے کو کوشش نہ کریں .جس میں شدت پیدا کرنے کے لئے میں پیرایہ اظہار کو مختلف طریقوں سے آزما رہا ہوں۔

اچھا تو اب اس واقعہ کی روداد سن لیں۔ ہوا یہ کہ وقوعہ کے دن ..... مگر ٹھہرئے جناب ایک اہم اور عجیب و غریب واقعہ کا آغاز جس کے SPELL سے میں ابھی تک نکل نہیں سکا' بڑے روایتی جملہ سے ہوتا ہے جو کم از کم مجھے بالکل نہیں جچا۔ دراصل میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔ ہر لفظ اور ہر جملے کے لئے چشم نگاہ بن جائیں۔

اچھا تو اب اس واقعے کو میں اس طرح پیش کرنا چاہوں گا۔

کچے اور نیم پختہ مکانوں کے ڈھیر..... جی جناب اب مجھے لفظ ''ڈھیر'' یا ''ملبہ'' اس واقعے کی مناسبت سے زیادہ بر محل نظر آتا ہے۔ مکانوں کا ملبہ' انسانوں کا ڈھیر' اوپر نیچے پڑے ہوئے انسانوں کے مردہ جسم' بے جان' بے حس و حرکت۔ آپ نے اکثر ایسے مناظر دوسری جنگ عظیم کی فلموں یا ناولوں میں دیکھے یا پڑھے ہوں گے' نازیوں کے مظالم کی داستانیں' پھر ویت نام میں امریکیوں کی ہولناکیاں اور اب ساؤتھ افریقہ میں سفید فاموں کی لرزہ خیز چیرہ دستیاں یہ ایک نفسیاتی مسئلہ بھی ہے۔ اس قسم کے مناظر اور واقعات دیکھ دیکھ کر آپ کو بعض اوقات خوشنما اور پختہ عمارات ملبہ کے ڈھیر میں تبدیل ہوتی دکھائی دیں' اور چلتے پھرتے انسان سوکھی سڑی لاشیں نظر آئیں۔

دیکھئے ایک بار پھر میرا ذہن لفظ ''ڈھیر'' اور ''ملبے'' کے استعمال پر حادثہ کے ''طلسماتی'' حصار میں داخل ہو کر الجھ گیا مگر خیر میں نے شاید واقعہ کا بیان یہیں کہیں سے شروع کیا تھا۔ گلی کے دونوں طرف مکانوں کے ڈھیر سے ذرا آگے ایک کچی سڑک پڑی رہتی۔۔جس پر سارا سارا دن دھول اڑتی رہتی۔ بس اسی کچی سڑک کی ایک جانب نیم کے پیڑ کے نیچے کسی نے جاپانی اور دیسی کھلونوں کی دکان کھول لی تھی۔ چابی اور کوک سے چلنے والے رنگ برنگ کے کھلونے' بندر' بھالو' ہاتھی' گھوڑے اور بڑی نزاکت سے آنکھیں کھولنے اور موندنے والی وہ گڑیا جو میرے دل و دماغ کے پردے سے آسیب کی طرح چمٹ کر رہ گئی اور جو میرے دل کی گہرائیوں میں طوفان بنکر گونج رہی ہے۔

جب بھی کوئی بچہ اپنے باپ کی انگلی پکڑے یا ماں کی موٹی کمر سے چمٹا ادھر سے گزرتا تو پیاری گڑیا نیند سے بیدار ہو جاتی اور پٹ سے اپنی دونوں خوبصورت آنکھیں کھول دیتی۔ بس بچہ یک دم مچل جاتا اور شور مچانے لگتا۔ یہ تماشہ روز ہوتا اور میں بھی اس قسم کا منظر ہر روز دیکھتا۔ اس کے باوجود اس منظر کا تاثر کبھی کم نہ ہوتا۔ میں اکثر ممٹی کے قریب ''گھٹنوں بیٹھا رہتا'' ''اوں' اوں..... اور نہ پتر نہ'' کی گردان کے درمیان جو کشمکش جاری رہتی اس کا اظہار نہ کوئی لفظ کر پائے گا اور نہ کوئی زبان۔ ''اوں۔ اوں اور نہ بیٹے نہ'' کے درمیان جو جذبہ رقص کرتا وہ آسمان کی نیلگوں چادر کے کسی کونے میں کسی ربانی زبان میں لکھا ہو تو ہو ورنہ کسی اور جگہ ایسی کسی تحریر کا تصور محال ہی نہیں' ناممکن ہے۔

میں اس جذبے کی وضاحت کے لئے ایسے متعدد جملے لکھ سکتا ہوں۔ لیکن مجھے پختہ یقین

ہے کہ ایسا کوئی لفظ یا جملہ اس جذبے کی حقیقی تصویر پیش نہ کر سکے گا میں وقوعہ کے روز معمول کے مطابق گلی سے نکل کر مٹی کے قریب ریت اور مٹی کی اس ڈھیری پر بیٹھ گیا جو اس جگہ کسی کام سے لا کر رکھی گئی تھی۔ اس پر نیم کے چھتنار پیڑ کا سایہ پڑ رہا تھا۔ بس جناب ٹھیک اسی وقت وہ حیران کن حادثہ رونما ہوا جس کی بے پناہ قوت کے "حصار" میں اب تک بندھا ہوا ہوں اور ہر لفظ اس واقعے کے زیر اثر لکھ رہا ہوں۔ یہ سوال اب تک میرے بے بس ذہن کے پردے پر گونج رہا ہے کہ!

آخر اس ننھی سی گڑیا کو کس نے قتل کیا؟

وہ ایک زور دار دھماکہ ہی تھا جس سے میرے اوسان خطا ہو گئے۔ کان کے پردے پھٹ گئے۔ زبان گنگ اور بصارت مجروح ہو کر رہ گئی۔ آنکھوں کی پلکوں کے گرنے سے پہلے پہلے کھلونوں کی وہ دکان اپنی جگہ سے اس طرح غائب تھی جیسے اس کا وہاں کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ بس ایک اندھے غار کا بڑا سا منہ کھلا ہوا تھا جس میں سے گاڑھا گاڑھا سیاہ دھواں اژدھے کے بل کھاتے ہوئے جسم کی طرح اوپر اُٹھ رہا تھا۔ گرد و غبار اور دھوئیں کے بادل۔

میں نے اندھوں کی طرح جھک کر اپنے پاؤں کے نیچے سے مٹی کو اپنی مٹھی میں بھر لیا۔ بس جی ریت اور مٹی کے ساتھ ہی میری مٹھی میں اس کا سر چلا آیا۔ منی گڑیا کے سنہرے بالوں کی بٹی ہوئے چٹیا اور سرخ ربن والا خوبصورت سر۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، بالکل بند....

بس جی یقین کریں، اس وقت سے میرے ذہن کے پردے پر صرف ایک ہی سوال انی کی طرح گڑ کر رہ گیا ہے۔ اس گڑیا کو کس نے قتل کیا ہے؟ جب میں نے یہ سوال کچھ لوگوں کے سامنے دھرایا تو وہ مجھے عجیب نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

کیا آپ کے پاس میرے سوال کا کوئی جواب ہے......؟

واپسی

بات عجیب اور حیرت انگیز تھی، میرے لئے ہی نہیں ان سب کے لئے جو اس وقت وہاں کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ سب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا' لوہے کے پنجرے کا دروازہ اٹھا ہوا تھا اور سرخ چونچ والے طوطے کا خوبصورت جوڑا آگے پیچھے اندر داخل ہو رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہاں سے چھٹنے والی بھیڑ دوبارہ جمع ہو چکی تھی۔

پریس کلب کی سڑک کے اس حصے پر سرور شہید روڈ نام کی تختی نصب ہے۔ سڑک کے بائیں طرف ملٹری اکاؤنٹس کے بیرکس اور دفاتر ہیں۔ کھپریل کی نیچی چھتوں پر پیپل، برگد اور جامن کے درختوں کی شاخیں جھکی ہوئی ہیں اور ان کے نیم روشن کمروں میں کلرکوں کے سر اور فائلوں کے ڈھیر ہلتے نظر آتے ہیں۔

ملٹری اکاؤنٹس کے دفاتر کے مقابل وکٹورین ایرا کا ایک قدرے سنسان بنگلہ ہے۔ جس کے وسیع لان میں مختلف قسم کے درختوں کے جھنڈ کھڑے ہیں۔ لان میں خودرو گھاس اور ببول کی جھاڑیاں بے ترتیبی سے اگی ہوئی ہیں۔ لان اور پریس کلب کی دیوار کے ساتھ بگرمتہ اور کیکٹس کی جھاڑیاں بھی ہیں، جن پر شاید کبھی توجہ نہیں دی گئی، مگر ان کو دیکھ کر انہیں گملوں اور ڈیکوریشن پاٹ میں سجانے کا خیال آپ ہی آپ ابھرتا ہے۔

بنگلہ کی سیما جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے مین سڑک گزرتی ہے۔ وہیں سگنل کا لال پیلا ہرا دیوا ایستادہ ہے۔ یہاں سے چار راستے شہر کی چار مختلف سمتوں میں سفر کرتے ہیں۔ یہیں وہ زینب مارکیٹ بھی ہے، جس کے فٹ پاتھ پر وہ انوکھا واقعہ رونما ہوا تھا اور جس کو دیکھ کر

وہاں موجود ہر شخص انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔

''بھئی یہ تو کمال ہو گیا۔''

''کیا ایسا ممکن ہے؟'' ان آوازوں اور سوالوں میں تحیر کا پہلو نمایاں تھا۔

زینب مارکیٹ کے اس کشادہ دروازہ کے باہر ان ٹیگ، سمور اور چمڑے کے جیکٹوں، ٹوپیوں، ہینڈ بیگ اور جدید قسم کے فیشن کے ملبوسات کی دوکانیں ہیں، ان کے علاوہ ہاتھی دانت پیتل چاندی اور قیمتی لکڑیوں کے بنے ہوئے تحائف کی بھی دکانیں ہیں۔ جہاں اکثرو بیشتر غیر ملکی جہاز رانوں، ملاحوں اور سفید فام امریکی سیاحوں کی بھیڑ دیکھنے میں آتی ہے۔ مقامی لوگ ادھر کا کم ہی رخ کرتے ہیں، کیونکہ ان دکانوں سے تحائف کی خریداری کے خیال تک کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ دکاندار بڑے متمول اور توہم پرست مسلمان ہیں۔

اس جگہ لوہے کی ریلنگ کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ پر ملیر گوٹھ سے ہر روز ایک چرخ میلا سا چڑی مار لوہے کے تین چار پنجروں کے ساتھ وہاں آکر بیٹھ جاتا۔ ''جن میں مختلف نسل و اقسام کے پرندے کبھی خاموش اور کبھی کبھی چہکاریں مار رہے ہوتے''۔ زینب مارکیٹ کے متمول دکانداروں کو پرندے خرید کر گھر لے جانے کا نہیں بلکہ جمعرات بھری مراد کا نعرہ لگا کر انہیں آزاد کرنے کا جنون ہے۔ بعض دکاندار کہتے....

''ادھر پنجرے کا دروازہ کھلتا ہے، ادھر رحمت کا۔ بلائیں پرندوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے بھاگ جاتی ہیں''۔ یوں تو ہر روز چڑی مار کے دو چار طوطے اور مینائیں آزاد کردی جاتیں لیکن جمعرات کے روز تو اس کے وارے نیارے ہوجاتے۔ اس روز منتیں مان کر چڑیں آزاد کی جاتیں۔

زینب مارکیٹ کے اندرونی حصے کے دکاندار بھی پرنس لیدر گارمنٹ کے قریب پہنچ جاتے تاکہ اس کار خیر میں برابر کے حصہ دار بن جائیں۔ بڑا عجیب منظر دیکھنے میں آتا جب کوئی دکاندار لوہے یا لکڑی کی تیلیوں کے پنجرے کا دروازہ کھولتا تو پرندے کچھ دیر احتیاط سے اپنے اطراف کا جائزہ لیتے پھر ایک دو بار اپنے پروں کو پھڑپھڑا کر پنجرے کے دروازے سے باہر نکلتے اور سگنل کے قریب غوطہ لگا کر اونچی اڑان کے لئے پروں کو پھیلادیتے، آزادی کی پہلی پرواز۔
ان کی پہلی منزل تو وہی ملٹری اکاؤنٹس اور سڑک کی دوسری جانب نیم خاموش بنگلہ کے لان میں پھیلے ہوئے درختوں کی کوئی گھنی شاخ ہوتی۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا کہ وہ وہاں بیٹھ کر

ایک لمبی قید و بند کے بعد خود کو حقیقی آزادی کا یقین دلاتے ہوں گے۔ ان کی دوسری منزل کون سی ہوتی ہوگی۔ اس بارے میں مجھے زیادہ معلوم نہیں۔ کیونکہ اس کھیل کے آغاز اور انجام کے دوران شام کی روشنی بجھ چکی ہوتی اور درختوں کی شاخیں مکمل طور پر تاریکی میں تحلیل ہوجاتیں۔ اس کھیل میں مجھے ہمیشہ دو باتیں یاد رہ جاتیں۔ ایک تو آغاز میں پرندوں کی لڑکھڑاتی ہوئی پرواز میں جوش پرواز اور دوسرے دکانداروں کے چہروں پر پرندوں کی آزادی سے پیدا ہونے والی شادمانی کا گہرا احساس....

اس کار خیر میں دکانداروں کے لئے جنت کا دروازہ کھلے نہ کھلے، مگر اس چڑی مار اور اس کے افراد خاندان کے لئے معقول آمدنی کا دروازہ ضرور کھل گیا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی ادھر ادھر کے گوٹھوں کے مزید دو تین چڑی مار وہاں پہنچ گئے تھے۔ ان کے وہاں آنے سے پہلے والے چڑی مار کے دھندے پر کچھ زیادہ برا اثر نہیں پڑا، کیونکہ زینب مارکیٹ کے دکانداروں کا منافع تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اس ماہ تو کمال ہی ہوگیا تلے اوپر تین امریکی جہاز کراچی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئے اور ملاحوں نے اچھی خاصی خریداری کرڈالی۔

یہ سب کچھ اس کار خیر کا نتیجہ تھا۔ جتنی تیزی سے خریداری ہوتی اتنی ہی تیزی سے پنجروں کے دروازے کھلنے لگتے۔

اس دن وہاں پہنچا تو دکانداروں کے علاوہ تماشائیوں کی خاصی بھیڑ جمع تھی، ایک روز پہلے خلیج کے کسی ملک کا جہاز لنگر انداز ہوا تھا اور ملاحوں نے دکانوں سے تحائف کی زبردست خریداری کی تھی۔ پرنس لیدر گارمنٹ کے مالک کا سب سے بڑا لڑکا عین الحق جوش میں آیا ہوا تھا اور اب تک وہ پندرہ کے لگ بھگ پرندے آزاد کرچکا تھا۔ اس کا فربہ اور شوگر کا مریض باپ بڑی رغبت اور پسندیدگی سے بیٹے کے شوق کو دیکھ رہا تھا۔ چڑی مار کے تقریباً تین پنجرے خالی ہوچکے تھے۔ بس ایک رہ گیا تھا۔ جس میں قدرے دو نایاب طوطے باقی رہ گئے تھے۔ ان طوطوں کا قد عام طوطوں سے چھوٹا اور سروں پر سفید رنگ کی کلغی تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ تل یا داغ تھے اور باقی جسم کا رنگ گہرا سبز تھا۔ طوطوں نے بھیڑ سے گھبرا کر ایک مرتبہ اپنے پروں کو پھڑپھڑایا تو سچ مچ بڑے خوبصورت دکھائی دیئے۔

عین الحق انہیں ہر قیمت پر آج ہی آزاد کرنے پر بضد تھا۔ اور چڑی مار اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنا چاہ رہا تھا۔ چنانچہ قیمت کا معاملہ ایک جگہ آکر

رک گیا تھا اور کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دکاندار کا لڑکا ان طوطوں کو خرید کر آزاد کرنے کے مشن میں ناکام رہے گا۔ جب مسئلہ زیادہ طول پکڑنے لگا اور شام کے سائے تیزی سے پھیلنے لگے تو اس کے باپ نے مداخلت کی اور اپنی روئی بھری موٹی صدری کی جیب سے دس دس کے دس نوٹ نکال کر چڑی مار کی جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا...

''ابے او چڑی کے تکّی' روز کماتا ہے' جیب بھر بھر کرلے جاتا ہے۔ آج دو پیسے کم لے لے گا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ گھنٹہ بھر سے نہ نہ کئے جارہا ہے' چل پکڑ سو روپے اور پنجرے کا دروازہ کھولنے دے۔''

بڑے سیٹھ کے سامنے چڑی مار بے بس ہوگیا۔ اسے یہ بھی ڈر لگا کہ کہیں آئندہ سیٹھ اس جگہ بیٹھنے کی اجازت نہ دے کیونکہ اپنے پرندوں کے سارے پنجرے دکان کے سامنے فٹ پاتھ پر ہی رکھتا تھا' اس سے ذرا آگے ٹھنڈے پانی کی سبیل تھی جو دکانداروں نے چندے کی رقم سے تعمیر کرائی تھی۔ چڑی مار ڈھٹائی سے ہنس دیا۔

''سائیں! آپ کی بات بھلا میں ٹالوں گا۔ نہ نہ....''

عین الحق کا چہرہ فرط مسرت سے کھل اٹھا۔ اس نے جلدی سے طوطے کا پنجرہ اپنے سر سے بلند کیا' دو تین دکانداروں نے جھٹ پٹ پنجرے کے پیندے کو تھام لیا تاکہ عین الحق اطمینان کے ساتھ دوروازہ کھول کر طوطوں کو اڑنے میں مدد دے سکے۔ سب کی نگاہیں پنجرے کے دروازے پر لگی تھیں۔ آخری دو قیدی آزاد ہونے والے تھے۔

پنجرے کا دروازہ کھل گیا تھا' سرخ چونچ اور سفید کلغی والے طوطوں نے کچھ توقف کیا۔ پھر ایک دوسرے کے پیچھے اپنے پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے پرواز کرگئے۔ اس کے ساتھ ہی وہاں موجود لوگوں نے بے ساختہ نعرہ لگایا ''وہ گئے۔ وہ گئے...''

تماشہ ختم ہوچکا تھا' آخری دو پرندے بھی آزاد ہوچکے تھے۔ بھیڑ آہستہ آہستہ چھٹنے لگی تھی اور چڑی مار اپنے میلے جھاڑن سے پنجروں کو صاف کرکے انہیں قد برابر لکڑی کے ڈنڈے کے ہکوں میں پھنسا رہا تھا۔ آخری دو پرندوں کا پنجرہ ابھی تک زمین ہی پر پڑا تھا۔ چڑی مار دوسرے پنجروں کی صفائی کرکے جب آخری پنجرے کی جانب متوجہ ہوا تو اس کے ساتھ ہی وہاں باقی رہ جانے والے لوگوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

سرخ چونچ اور سفید کلغی والے طوطوں کا خوبصورت جوڑا سگنل کے ہرے پیلے سرخ

رنگ کے دیو کے سر کے اوپر سے غوطہ لگا کر لوہے کی پتلی پتلی سلاخوں والے پنجرے میں دوبارہ داخل ہو رہا تھا۔

☆

جنگل

اس کا نیا دھندا کامیابی سے چل رہا تھا اور اسے توقع سے زیادہ کامیابی مل رہی تھی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اگر اس کا یہ دھندا کسی رکاوٹ کے بغیر دو تین ماہ اسی طرح چلتا رہا تو وہ الگ سے اپنا کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ لیکن اچانک اسے بڑے آدمی کا حکم ملا۔

"اسے آخری دن سمجھو، گوشت کے اس لوتھڑے سے فی الفور چھٹکارہ حاصل کرلو۔ کل سے تمہیں ایک بڑے اور نئے اسائنمنٹ کی تیاریاں شروع کرنی ہیں۔"

اس میں بڑے آدمی کا حکم ٹالنے کی سکت نہ تھی۔ وہ بھاگ کر شہر کے کسی کونے میں چھپ جائے اس کے کارندوں کی عقابی نگاہیں اسے ڈھونڈ نکالیں گی اور پھر خوف سے اس کے کسرتی جسم میں جھرجھری پیدا ہو گئی۔ بڑا آدمی' اس کا یہی CODE NAME تھا۔ اس کے سارے مددگار اسے اسی نام سے پکارتے تھے وہ صرف ایک بار اس کی معمولی جھلک دیکھ پایا تھا اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آیا۔ کیونکہ پیشانی پر جھکے ہوئے اطالوی طرز کے قیمتی ہیٹ میں اس کا نصف چہرہ چھپا ہوا تھا۔ اسکی ایک انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی اس کی آواز کرخت اور بھدی تھی اور سننے والے کے اعصاب پر ناگوار اثر ڈالتی۔

شیراؤ کافی دیر سے اس کے تعاقب میں تھی۔ کار میں ڈرائیور سمیت تین شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ پچھلی نشست پر دھنسا ہوا تنومند شخص اپنے قیمتی لباس اور انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی کے سبب "بڑا آدمی" لگ رہا تھا۔ اس کی قیمتی ہیٹ نے اس کے نصف چہرے کو چھپا رکھا تھا۔

شیراڈ احتیاط اور خاموشی کے ساتھ صدر کی مختلف شاہراہوں اور گلیوں میں اس بھک منگے نوجوان کے تعاقب میں رینگ رہی تھی جو لکڑی کی ایک ٹرالی میں ادھ موئی بڑھیا کو ڈالے بھیک کے لئے بڑی فنکاری کے ساتھ اپنی آواز کے حربے استعمال کر رہا تھا۔ چند ہی دنوں میں وہ خود کو ایک بڑا آرٹسٹ سمجھنے لگا تھا۔ جب وہ ٹرالی کار سے اترنے والی بیگمات یا کسی سیٹھ کے سامنے لاتا تو اس کی آواز میں ایسی رقت طاری ہو جاتی کہ گزرنے والوں کے قدم خود بخود رک جاتے اور اس کی ٹرالی میں ریز گاری یا پانچ روپے کا نوٹ قبول ہونے والی دعا کی صورت میں ٹپک پڑتا۔ اسے بہت پہلے اندازہ ہو گیا تھا کہ گوشت کا یہ لوتھڑا ' اسے تین ماہ میں خاصی رقم دلادے گا۔ اور وہ اس عذاب سے نکل کر کوئی چھوٹا موٹا دھندا شروع کر دے گا۔ اپنا دھندا۔ جس میں اس کا حکم ٹالنے کی جرأت کوئی نہیں کر سکے گا۔ اپنی دنیا ' جس میں اس کی حیثیت ایک چھوٹے گاڈفادر کی ہوگی۔

اپنی چھوٹی سی دنیا کے چھوٹے سے گاڈ فادر کے خواب کی تعمیر کے لئے نئے دھندے کی راہ اس کے ایک گہرے دوست نے دکھائی تھی ۔ جو قتل کی تین چار وارداتوں میں ملوث تھا. اور اب وہ فقیر کنکٹے کے اڈے میں روپوشی کے دن کاٹ رہا تھا۔ اس نے راسوامی کے علاقے میں ایک قدیم اور کائی زدہ مندر کے پچھواڑے فقیر کنکٹے سے ملاقات کی۔ اس کی شکل اور حلیہ دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ روپے کی خاطر دنیا کا غلیظ ترین کام بھی کر سکتا ہے۔ اس کے فلسفہ حیات میں پیسے کے لئے ہر چیز جائز تھی۔

اس نے واضح اور دو ٹوک انداز میں بات کی اور اپنے دوست کی وساطت سے تین ماہ کے لئے بڑھیا کا سودا کر لیا۔ وہ کم از کم چھ ماہ کا کنٹریکٹ کرنا چاہتا تھا مگر کنکٹا پھیل گیا۔
"سال بھر کی بکنگ کی پیشگی رقم میری جیب میں ہے۔ تین ماہ سے ایک گھنٹہ بھی زیادہ نہیں دوں گا۔"

یہ اس کے دھندے کا آغاز تھا۔ اور وہ کامیابی سے سرشار ٹرالی لے کر صدر کی گلی میں مڑا ہی تھا کہ شیراڈ اس کے سر پر پہنچ گئی. اور حکم ملا" بڑھیا سے جلد نجات حاصل کر لو۔"
"کیوں"۔۔۔۔۔؟ اس کے حلق سے بے اختیار نکل گیا۔
شاید انہوں نے لفظ کیوں کبھی نہیں سنا تھا۔ اس کے محافظوں نے ریوالور نکال لئے بڑے آدمی نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔

"یہ ہمارے کام کا آدمی ہے۔ نئی اسائنمنٹ کے لئے اس سے موزوں آدمی نہیں ملے گا۔ اسے ضائع مت کرو۔" باس نے اس سے معاملے کی بات کی۔

"تم ہمارے کئی چھوٹے موٹے کام انجام دے چکے ہو۔ تم نے ہمیشہ ہمارے اعتماد کو برقرار رکھا ہے شائد اسی لئے اتنے بڑے اسائنمنٹ کے لئے تمہیں منتخب کیا گیا ہے۔ یہ کام تم ہی کروگے۔ سمجھے۔!

"مگر میں تو اس بڑھیا کو تین ماہ کے لئے بک کر چکا ہوں۔ رقم بھی ایڈوانس دے دی ہے۔"

"ہشت ختم کرو یہ احمقانہ باتیں"۔ بڑے آدمی نے ہاتھی کے سونڈ جیسے ہاتھ اٹھا کر اسے درمیان ہی میں ٹوک دیا۔ "تم اس بڑھیا سے جلد نجات حاصل کروگے۔" اس کے قدم ست پڑگئے تھے اور دل پر پتھر سا بیٹھ گیا تھا وہ امام کارپٹ والی گلی سے نکل کر زیب النساء اسٹریٹ پر پہنچا۔ ثناء اللہ کے شوروم کے ساتھ ساتھ دکانیں رنگ برنگ مرکری ٹیوب لائٹس میں جگمگا رہی تھیں۔ وہ جس تیزی سے صدر کی گلیوں اور سروس لینوں میں ٹرالی کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہا تھا۔ اسی سرگرمی سے اس کے ذہن میں بار بار سوال کا بچھو ڈنک مار رہا تھا تو گویا بڑھیا کا جھٹکا بھی کرنا ہے۔ اسے بڑھیا پر تھوڑا سا ترس آیا۔ شاید زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے دل میں کسی کے لئے ہمدردی کا کرنٹ دوڑا۔ بڑھیا کا بیٹا فقیرا۔ انسانوں کی خرید وفروخت اور شقی القلبی میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس نے اپنی ماں تک کو نہیں چھوڑا۔ اسے تین ماہ سے لے کر چھ ماہ کی مدت کے لئے سینکڑوں بار فروخت کر چکا ہے۔ ہر بار رقم گنتے ہوئے سوچتا۔ "اگر اس کے پیٹ سے کوئی احمق پیدا ہوتا تو اپنے پلے ہی سے اس پر رقم خرچ کر رہا ہوتا۔ ہونہہ۔" اگر کوئی بڑھیا کے سودے میں توسیع کرنا چاہتا تو اس مدت کے معاوضہ کے علاوہ الگ سے چالیس فی صد کے حساب سے منافع بھی دینا پڑتا۔ گوشت کا یہ لوتھڑا جو فقیر کنکٹے کی ماں تھی، دراصل بھک منگوں کی دنیا میں سونے کی کان سمجھی جاتی۔ قدرت نے شکل صورت اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے کچھ اس طرح تیار کیا تھا کہ اس کو دیکھ کر ہمدردی کا جذبہ خود بخود پیدا ہو جاتا اور ہاتھ جیب میں پہنچ جاتے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ کنکٹے نے ماں کے جسم کو ہڈیوں سے بھی بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ محض گوشت کا ایک بڑا سا لوتھڑا بن کر رہ گئی تھی جس میں بڑی ملائم اور لجلجی سی حرکت رہتی۔

وہ بیگمات کے جذبہ ترحم اور ان کے اندر چھپی ہوئی ہمدردی کی ڈگری بڑھانے کے لئے

مختلف قسم کے نفسیاتی حربے استعمال کرتا۔ وہ پروفیشنل تو نہیں تھا۔ مگر بنیادی طور پر ذہین تھا ..دو چار دنوں میں وہ کنکٹے کی طرح خود بھی اس کاروبار کا ایک تجربہ کار کھلاڑی بن چکا تھا بعض اوقات تو بڑھیا کو اذیت دینے سے بھی گریز نہ کرتا جب کچھ وقت گزر جاتا اور ٹرالی کے میلے چیتھڑے پر کوئی نوٹ یا سکہ نہ گرتا تو اس کی تشویش بڑھ جاتی وہ بھیک کے ہر لمحہ کو سکے میں تبدیل کرنا چاہتا۔ بڑی آہستگی سے وہ بڑھیا کے جسم کے نصف حصے سے کپڑا ہٹا دیتا پھر اس کے جسم کے کسی نازک حصے پر پن مارتا جس کی تکلیف سے گوشت کے لوتھڑے میں ایک عجیب سی تھرتھراہٹ پیدا ہوتی اور اس کی باریک 'مدہم آواز میں گندی گندی گالیوں کا طوفان امڈ پڑتا۔ گالیاں اس قدر چٹ پٹی اور مزیدار ہوتیں کہ اکثر اوقات ٹرالی کے گرد تماش بینوں کی بھیڑ لگ جاتی اور اس کے گندے لحاف پر سکوں کا ڈھیر لگ جاتا۔ بڑھیا کی گالیاں سن کر محسوس ہوتا کہ وہ زندہ اور جاندار ہے۔

بھیڑ چھٹ جاتی تو وہ بڑھیا کو چمکار کر چرس کا سگریٹ اس کے سوکھے سڑے ہونٹوں سے لگا دیتا۔ چرس کا دھواں سونگھتے ہی جانے اس بے جان لوتھڑے میں کش کھینچنے کی طاقت کہاں سے آجاتی۔ بڑھیا اس کی ماں کو ایک غلیظ گالی دے کر سوٹا لگاتی اور وہ بے حیائی سے ہنستا ہوا.. ٹرالی آگے بڑھا دیتا اس دھندے سے پہلے وہ کئی چھوٹی موٹی وارداتوں کا ارتکاب کر چکا تھا۔ رات کے اندھیرے میں چمکتی ہوئی دھار کے چاقو کے ہاتھ بھی دکھائے مگر اس کے اناڑی ہاتھوں سے کوئی راہ گیر مرا نہیں۔ زخمی ہو کر ہسپتال ضرور پہنچ گیا۔ ایک دوبار پکڑا بھی گیا مگر بڑے آدمی کے آدمیوں نے اسے جیل جانے سے بچا لیا پولیس بھی ان سے خائف رہتی تھی۔ انہوں نے کہا تھا وقت آنے پر تم سے کوئی بڑا کام لیا جائے گا۔ فی الحال انتظار کرو اور کوئی ایسا دھندا نہ کرو جس سے تم پولیس کی نظر میں آجاؤ۔

اس نے ایسے چھوٹے موٹے بے ضرر کام کے بارے میں بہت غور کیا جس سے اس کے پیٹ کی آگ بھی بجھتی رہے اور پولیس کی نگاہوں سے بھی بچا رہے۔ اسی دوران اس کے وارداتیہ دوست نے فقیر کنکٹے کا پتہ دیا اور بڑھیا کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ کنکٹا دھندے کے لئے ماں کو استعمال تو ضرور کرتا۔ مگر اس کے کھانے پینے کا بڑا خیال رکھتا کیونکہ اس کے سارے دھندوں میں آمدنی کے اعتبار سے یہ دھندہ زیادہ منافع بخش تھا۔ جب بڑھیا کو ٹھیکے پر کسی کو دیتا تو بچھو جیسے چہرے کو مزید زہریلا بناتے ہوئے کہتا۔

"زندہ دے رہا ہوں۔ زندہ ہی واپس لوں گا۔ سمجھ گیا نا"۔ بڑھیا کی ڈیلیوری لینے والا شخص کپکپا کر رہ جاتا۔ کچھ یہی حال اس کا بھی ہوا تھا۔ مگر دوسروں سے ذرا کم کیونکہ وہ اس دنیا میں بڑے آدمی کے قریب آنے کے بعد کچھ نڈر اور بے خوف ہو گیا تھا۔

آج دھندے کی پانچویں یا چھٹی شام تھی۔ وہ اپنی جھگی سے ٹرالی میں بڑھیا کو ڈال کر نکلا ہی تھا کہ شیراڈ دوبارہ اس کے قریب آکر رکی۔ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے لمبوترے چہرے والے شخص نے گردن نکال کر کہا۔ بڑے آدمی نے پیغام دیا ہے

"کیا"؟

"تم نے اپنا کام ختم نہیں کیا۔؟"

"مگر یہ بڑھیا۔ تین ہزار روپے دیئے ہیں"

"تم اپنے پیسوں کی فکر نہ کرو۔۔ بڑھیا سے فی الفور چھٹکارہ کرلو اور ہاں اس کو کنکٹے کے ڈیرے پر واپس نہیں پہنچانا۔ فقیرا چوکنا ہو جائے گا۔ وہ ہمارے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔"

"پھر میں کیا کروں۔۔۔۔۔؟ بڑھیا کو ڈیرے پر بھی نہ پہنچاؤں اور نجات بھی حاصل کرلوں کیسے ہوگا صاحب؟"

"راستہ ہم بتائے دے رہے ہیں۔" وہ ترکیب سن کر اپنی ساری بے حسی کے باوجود کپکپا کر رہ گیا۔

"گناہ ثواب کی باتیں مت کرو۔ تم سے جو کہا جائے وہ کرو ورنہ۔۔" اتنا کہنے کے بعد اس نے اپنی سارس جیسی گردن گاڑی کے اندر کرلی اور شیراڈ تیزی سے گلی کا موڑ کاٹتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

اسے آج ہی ہر قیمت پر اس ہدایت پر عمل کرنا تھا۔ ماضی میں جن لوگوں نے ان کی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ ان کی دردناک موت کا تماشا وہ دیکھ چکا تھا پولیس بھی جانتی ہے کہ انہیں کس نے قتل کرایا مگر تفتیش، قاتل نامعلوم سے آگے نہ بڑھ سکی اور فائل کو داخل دفتر کرنا پڑا۔

ان کی حکم عدولی بھی نہیں کر سکتا۔ نہ کوئی پنگا لے سکتا ہوں۔ میرے لئے تو ان کا معمولی کارندہ ہی کافی ہوگا۔ کسی جھاڑی سے کسی گمنام سڑک کے کنارے سے کئی دنوں کے بعد میری

مسخ شدہ لاش برآمد ہوگی۔ کوئی نہیں پہچان سکے گا بڑے لوگوں کی واردات بھی پراسرار ہوتی ہے۔

جب وہ پہلی بار بڑے لوگوں کا ایک مشن مکمل کر کے پہنچا تو اس لمبوترے چہرے والے نے جس کی آنکھوں کے نیچے چاقو کا گہرا نشان تھا۔ اس کی کمر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "بڑا آدمی تم سے خوش ہے۔ تمہارا ہاتھ صاف اور بدن میں بندر جیسی پھرتی ہے۔ شکل وصورت سے بھی بھلے نظر آتے ہو۔ آؤٹ ڈور کے لئے بالکل فٹ ہو۔ بس ذرا محنت کی ضرورت ہے۔ تم شاید نہیں جانتے ہماری دنیا میں داخل ہونے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ جان جوکھوں میں ڈالنا ہوتا ہے پھر کہیں جا کر انٹری ملتی ہے۔ وہ بھی ایسی کہ اگر ٹوٹ جاؤ تو راز افشانہ کرسکو۔ جتنا تم جانتے ہوگے، اس سے کہیں زیادہ پولیس والے جانتے ہوں گے۔ ایک بار ہماری تنظیم میں شامل ہونے کے بعد باہر نکلنے کے سارے دروازے بند ہوجاتے ہیں۔ ہم تمہاری نگرانی سال بھر سے کررہے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ تو وہی تمہاری ذاتی خوبیاں ہیں۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ تم تنہا ہو۔ کوئی والی وارث نہیں۔ جھڑے چھانٹ ادھر مرے ادھر معاملہ ختم۔"

وہ اپنے خیالوں میں گم ٹرالی کو آہستہ آہستہ بڑھاتا ہوا امام کارپٹ والی گلی سے نکل کر زیب النساء اسٹریٹ پر پہنچ گیا۔ شام رنگ وبو میں نہارہی تھی۔ وہ ٹرالی لے کر ماشاءاللہ کے قد آدم شوکیس کے سامنے کچھ دیر کے لئے کھڑا ہوگیا۔ ایک حسین عورت ساڑھی باندھے مسکرارہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک بچہ تھا اور پھول جیسی بچی جو ماں کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ساتھ ہی فریج پاٹ میں پھولوں کے گلدستے سج رہے تھے۔ وہ لمحہ بھر کے لئے اس ماحول کا حصہ بن گیا۔

اچانک بچھو نے ڈنک مارا۔

"گوشت کے اس لوتھڑے سے آج ہی بلکہ ابھی نجات حاصل کرلو۔" اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ یہ بڑھیا میری ماں بھی تو ہوسکتی تھی۔

اس نے فوراً اس خیال کو جھٹک دیا۔ شیراڈ فاصلے سے اب بھی اس کے تعاقب میں تھی سارس کی گردن والا شخص اس کی حرکات وسکنات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اب وہ پوری طرح CONSCIOUS تھا۔ سڑکوں کی لائیٹس مکمل طور پر جل چکی تھیں۔ شیراڈ اس کے قریب پہنچی۔ کھڑکی سے وہی بھاری بھرکم ہاتھ نکلا جس کا ایک دوبار وہ دیدار کرچکا تھا FINISH

HER ہم زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے۔ شیراڈ بیک ہوئی۔ پھر سگنل کراس کر کے کاروں کے ہجوم میں گم ہو گئی۔

اس نے ٹرالی میں گوشت کے اس لوتھڑے کو دیکھا جو زندہ انسانوں کی زندگی کا سامان بنی ہوئی تھی۔ کنکٹا فقیرا کی ماں اور اس کا ذریعہ روزگار۔ اس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس کھینچی۔ تو گویا یہ کام میرے ہی ہاتھوں ہونا تھا۔ چلو پھر دیر کس بات کی۔ وہ ٹرالی لے کر صدر کے اس علاقے میں پہنچ گیا جو شام کے وقت ٹریفک کے "جنگل" کے نام سے پکارا جاتا ہے اس جنگل کے درمیان ٹریفک سگنل کا دیو کھڑا قہقہہ لگاتا ہے۔ اس کی ایک آنکھ سرخ ہوتی تو گاڑیوں کا طوفان رک جاتا ہے۔ دوسری جانب دیو کی آنکھ ہری ہو جاتی تو گاڑیوں کا طوفان زوں، زوں کر کے چل پڑتا ہے۔ اس پاگل پن کی دوڑ میں انسان بہت حقیر اور چھوٹا دکھائی دیتا اور پھر کنکٹا فقیرا کی ماں کی، جو محض گوشت کا ایک لوتھڑا رہ گئی تھی اس جنگل میں کیا حیثیت تھی؟

اس نے ایک نگاہ ٹرالی پر ڈالی بڑھیا کسمسائی اور انتہائی غلیظ گالی دی۔ میری ٹانگ پر چادر تو ڈال۔

اس نے چادر ڈال دی اور ٹرالی کا ہینڈل آہستہ سے چھوڑ دیا۔ ٹرالی اس جنگل کی جانب تیزی سے بڑھنے لگی جس کے درمیان سگنل کا دیو آنکھیں دبا دبا کر قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ واپس مڑا اور گھوم کر عقب میں آنے والی شیراڈ میں بیٹھ گیا۔ اس نے مڑ کر جنگل کی طرف دیکھا۔ ٹرالی کے ساتھ گوشت کا لوتھڑا فضا میں بکھر رہا تھا۔ اور سگنل کا دیو آنکھیں دبا دبا کر قہقہے لگا رہا تھا۔

☆

وہ لمحہ

انہوں نے جب مجھے لوہے کے مضبوط کٹہرے میں کھڑا کیا' جو میرے قد کے برابر تھا تو وسیع ہال میں اک دم سے سناٹا چھا گیا۔ جو لوگ ہال میں موجود تھے' ان کی زبان اور شکلیں ایک جیسی تھیں' انہوں نے مجھے اشتیاق اور تعجب سے دیکھا۔

"اچھا' تو یہ ہیں ذات شریف۔"

بھاری بھرکم اور خشخشی داڑھی والے منصف نے بھی موٹی عینک کے اوپر سے مجھے گھورا۔

"ہوں۔ تو یہ ہے' قانون شکن۔"

"جی جناب والا" ..... وکیل استغاثہ کی آواز میں ملزم کو کیفر کردار تک پہنچانے کا ولولہ تھا۔

"اس شخص نے ہمارے تعمیر کردہ "عشرت کدہ" سے فرار ہونے کا بار بار ارادہ کیا' جہاں اس کے آرام و آسائش کا ہر طرح سے خیال رکھا گیا مگر یہ. شخص اتنا ڈھیٹ' عادی اور پختہ کار ہے کہ ہماری عطا کی ہوئی سہولتوں کو ٹھکرا کر کفران نعمت کا مرتکب ہوا۔"

"جناب والا۔ اس بار تو اس نے حد ہی کر دی کہ ایک ایسے راستہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا جس کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک چالاک اور مکار شخص ہے۔ جو ہمارے بنائے ہوئے قانون اور ضابطہ کو ہر قیمت پر توڑنا چاہتا ہے......"

"جناب والا..... اسے ایسی سزا دی جائے کہ آئندہ یہ ہمارے تعمیر کردہ "عشرت کدہ" سے باہر نکل بھاگنے کا تصور بھی نہ کر سکے"۔ وکیل استغاثہ نے میرے خلاف طویل فرد جرم سناتے

ہوئے ایسے فخریہ انداز سے جج کی جانب دیکھا جیسے اس نے اپنی تقریر میں مجھے سزا دلوانے کے لئے دلائل کے انبار لگا دیئے ہوں۔ جج نے سرہلاتے ہوئے ایک بار پھر اپنے بھاری فریم کی عینک کے اوپر سے مجھے حقارت سے گھورا' اور بڑی آہستگی سے بڑبڑایا۔

"بدمعاش....."

میں نے جج کے ہلتے ہوئے ہونٹوں سے اندازہ لگا لیا کہ اس نے چن کر میرے لئے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔

میرا یہ جرم ان کے نزدیک ناقابل معافی ہے کہ میں نے ان کے تعمیر کردہ "عشرت کدہ" سے فرار ہونے کی بار بار کوشش کی۔ یہاں یہ بتا تا چلوں کہ وہ جس عشرت کدہ کا بار بار حوالہ دے رہے ہیں وہ دراصل ایک ۱۸X۲۴ کا کمرہ ہے۔ جس کی پختہ دیواریں سپاٹ اور چھت بہت اونچی ہے۔ جس کا دروازہ ہمیشہ مقفل رہتا ہے۔

کہتے ہیں نا کہ اچھا اور دلیر جنگی قیدی وہی ہے جو دشمن کی قید سے فرار ہونے کی مسلسل کوشش کرے۔ ایک بار' دو بار' تین بار' اس وقت تک متواتر کوشش کرتا رہے۔ جب تک وہ دشمن کی قید سے آزاد یا پھر زندگی سے رہائی نہ پالے۔ کنسنٹریشن کیمپ اور ۱۸X۲۴ کے کمرے کے قیدی میں ایک بنیادی فرق کا خیال ضرور رکھا جائے کہ کیمپ کی زندگی میں بے شمار پابندیوں کے باوجود صبح اور شام کے تغیر کے ساتھ وسیع اور نیلگوں آسمان کی زیارت کا موقع مل جاتا ہے۔ دھوپ کی چمک اور روشنی کی کرن نظر آجاتی ہے۔ موسموں کی تبدیلی کا سراغ مل جاتا ہے۔ گو یہ کسی قیدی کے لئے مناسب بات نہیں کہ آسمان کی زیارت اور روشنی کا احساس اسے قید سے فرار ہونے کے ارادہ کی راہ میں رکاوٹ بن جائے اور وہ خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ قیدی کے اندر مکمل آزادی کی خواہش چاہے موہوم سہی' جب تک باقی رہے فرار ہونے کے منصوبہ پر بار بار عمل کرنا چاہئے۔ اسے زندگی کے سب سے خوبصورت ارادے کا نام دیا جاسکتا ہے۔

کنسنٹریشن کیمپ اور میرے کمرے کے درمیان اسیری کے ماحول میں جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے۔ بنیادی فرق موجود ہے۔ وہاں کبھی کبھار روشن آسمان اور چمکیلی دھوپ نظر آجاتی ہے۔ مگر میرے کمرے کے اندر قدرت کی یہ نعمتیں ناپید ہیں۔ گو اس منقش اور جگمگاتے کمرے میں زندگی کی تمام سہولتیں اور آسائشیں موجود ہیں۔

کمرہ یا ان کی زبان میں "عشرت کدہ" خوش رنگ بلبوں سے ہر وقت منور رہتا ہے۔ دیواروں پر قدرتی مناظر کی بڑی بڑی پینٹنگز آویزاں ہیں۔ قدیم طرز کے فلاور پاٹس 'این ٹیکز اور الماریاں ہیں۔ چمکدار' نرم اور آرام دہ صوفے اور کشن سلیقے سے رکھے ہوئے ہیں۔ فرش پر بیل بوٹے سے مزین سرخ رنگ کا ایرانی قالین ہے۔ رائٹنگ ٹیبل' لکھنے کا پیڈ اور قلمدان میں مختلف اقسام اور سائز کے قلم اور بال پین موجود ہیں۔ وقت پر لذیذ کھانا' یخ پانی اور طلب کرنے پر پسندیدہ مشروب حاضر کردیا جاتا ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں جدید طرز کا ریموٹ کنٹرول ٹی وی اور ریڈیو ان ڈور تفریح میں شامل ہے۔ گویا زندگی کی تمام سہولتوں کے ساتھ اس کمرے کو ایک ایسا جدید اور انوکھا مکان قرار دیا جاسکتا ہے' جس میں بظاہر اسیری عیاشی نظر آتی ہے۔ مگر یہ فیصلہ کرنے سے پہلے میں ان تفصیلات کے ساتھ جو اوپر بیان کی گئی ہیں' یہ بتاتا چلوں کہ مجھے اس کمرے سے باہر نکلنے کی آزادی نہیں۔ اس کا ارادہ یا تصور بھی جرم ہے۔ میں نے جب کبھی اس کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کی' آسیب زدہ آہنی دروازہ مقفل ملا' کمرہ کی دیواریں ٹھوس' پختہ اور بہت بلند ہیں۔ اس میں سے روشنی کی معمولی کرن کی آمد کا تصور بھی محال ہے۔

اس کمرے میں میری اسیری کی جو دوسری اہم بات ہے وہ کچھ مضحکہ خیز ضرور ہے مگر قابل غور بھی ہے۔

کمرے میں بلبوں کی روشنی کے سوا اب میرے اندر ہر قسم کی روشنی کا احساس بتدریج ختم ہوتا جارہا ہے۔ یہ بلب شب و روز یکساں پاور سے روشن رہتے ہیں۔ دیواروں پر جو لینڈ اسکیپ ہیں' وہ الٹے لگائے گئے ہیں.. جس سے میرے دل و دماغ پر ہر وقت جھنجلاہٹ کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ یہ ان کا ایک نفسیاتی حربہ ہے۔ جو مجھ پر آزمایا جارہا ہے۔ چند بڑی شخصیتوں کی پورٹریٹ بھی الٹی لگائی گئی ہیں۔

کمرے کی مغربی سمت میں جہاں کشن اور صوفے رکھے ہوئے ہیں' ان کی پشت پر کتابوں کی چند خانہ دار الماریاں رکھی ہوئی ہیں۔ کبھی ان میں بے شمار کتابیں سجی ہوئی تھیں مگر اب زیادہ تر خالی ہیں۔ صرف مخصوص موضوعات پر چند ایسی کتابیں چھوڑ دی گئی ہیں جن کے بار بار مطالعہ سے میں بری طرح اکتا گیا ہوں۔ کتابوں کی ایک ایک سطر حفظ ہو چکی ہے۔

رائٹنگ پیڈ بھی ہے۔ مگر اس میں کاغذ نہیں ہے۔ قلم اور بال پین موجود ہیں مگر روشنائی

سے خالی........ میں نے خود کو اس وقت انتہائی بے بسی اور مایوسی کے عالم میں گھرا پایا جب کبھی کچھ لکھنے کے جذبہ سے مغلوب ہو کر میز تک پہنچا..........

شروع شروع میں مجھے لکھنے پڑھنے کی اجازت تھی۔ مگر میرے مطالعہ کے موضوعات اور تحریریں دیکھنے کے بعد مجھ سے یہ آزادی اس صورت میں واپس لے لی گئی کہ میز پر رکھے ہوئے ٹیبل لیمپ سے بلب' پیڈ سے کاغذ اور قلم سے روشنائی غائب کر دی گئی۔

اس کمرے کی تنہائی میں میری تفریح طبع کے لئے ایک ٹی وی اور دو سراٹرا نسسٹر ہے..... مگر یہ دونوں چیزیں میرے لئے اس وقت کوفت کا باعث بن جاتی ہیں' جب ان کے ذریعہ چند مخصوص پروگرام بار بار پیش کئے جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک تو میں اپنی تنہائی سے گھبرا کر ان پروگراموں کو دیکھتا اور سنتا رہا مگر' ایک وقت ایسا آیا جب ٹی وی کھولنا تو درکنار اس کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔ اس بند کمرے میں یہ ایک ہولناک تجربہ ہے...... میں بعض اوقات اپنی بے بسی پر پاگلوں کی طرح چیخنے چلانے اور اپنے سر کے بالوں کو نوچنے لگتا ہوں۔ مگر میری مدد کے لے کوئی نہ آتا۔

مجھے کمرے سے باہر نکلنے کی آزادی نہیں۔ آہنی دروازہ ہمیشہ مقفل رہتا ہے۔ میرے نزدیک موسموں' رتوں اور رنگوں کا امتیاز تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ میں اکثر آرام دہ صوفے یا نرم قالین پر بیٹھ کر پہروں کمرے کی چھت اور سپاٹ دیواروں کو گھورتا رہتا ہوں جہاں میرے احساسات کے لئے کوئی لفظ تحریر نہیں ہے۔ میں اس کمرے کا ایسا باسی ہوں جو اندھا' گونگا اور بہرہ ہے۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ ایک دلیر اور اچھے قیدی کے لئے ضروری ہے کہ وہ فرار ہونے کی کوشش اس وقت تک کرتا رہے جب تک وہ آزاد نہیں ہو جاتا یا پھر دشمن کی گولی کا نشانہ بن کر مکمل آزادی حاصل نہیں کر لیتا۔ میں نے بھی اس قید سے فرار ہونے کے بار بار جتن کئے۔ مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ میرے اندر یہ خواہش مچلتی رہی کہ کم از کم اس کوشش میں ایک بار آسمان کی نیلاہٹ اور دھوپ کی چمک دیکھ لوں۔

گیارہ سال کی طویل اور صبر آزما جدوجہد کے بعد میں باتھ روم کے کموڈ کے ساتھ زمین کھودنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ایک کند چھری ہے جو گیارہ سال سے میرا ساتھ دے رہی ہے میں نے اس کی حفاظت جان سے زیادہ کی۔ جب بھی موقع ملا تھوڑی تھوڑی زمین کھودتا رہا

یہاں تک کہ ایک دن گموڈ کے ساتھ سیوریج لائن کا بڑا سا سیاہ منہ نظر آگیا۔ میں نے مزید چند ماہ کی جدوجہد سے سوراخ کو اتنا بڑا کرلیا کہ اس میں آسانی سے اتر جاؤں۔ مین سیوریج لائن تک پہنچنے میں مزید چند ماہ لگ گئے۔ مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ اور اپنے کام کو آگے بڑھاتا رہا۔ اس دوران جن ذہنی اور جسمانی اذیتوں سے دوچار رہا وہ ناقابل تصور ہیں۔ مگر میں قید کی اذیت سے نجات پانے کی خواہش میں یہ سارے مصائب برداشت کرتا رہا۔ یہ میرے سابقہ تجربوں سے کہیں زیادہ جان جوکھوں کا کام تھا۔

سیوریج لائن کے بدبودار پانی میں اترنے کا تصور لرزہ خیز تھا۔ گھپ تاریکی میں کتنی دیر بھاگتا رہا مجھے کچھ ہوش نہیں۔ بس گٹر کی سڑاند اور بدبو سے دماغ پھٹتا محسوس ہوا مگر کچھ دیر بعد میں اس احساس سے بھی محروم ہوگیا۔ دُہرا ہوکر دوڑتا رہا' میرے کپڑے تار تار ہوگئے۔ جسم جگہ جگہ سے چھل گیا اور گٹر کا پانی تازہ زخموں پر نمک کا کام دیتا رہا مگر کسی جگہ رکا نہیں۔ میری کوشش تھی کہ جب تک میرے فرار ہونے کی خبر میرے عشرت کدہ کے نگہبانوں تک پہنچے' میں ان کی پہنچ سے اتنا دور نکل جاؤں کہ دوبارہ ان کے ہاتھ نہ آسکوں۔ اس عالم میں میں کب تک دوڑتا رہا اور کتنا فاصلہ طے کیا' اس کا مجھے کوئی ہوش نہیں' ہاں' یہ ضرور احساس رہا کہ اتنا فاصلہ تو قیامت کے درمیان بھی نہ ہوگا۔

میں تھک کر نڈھال ہوگیا. اور گٹر کے ابلتے ہوئے بدبودار پانی میں گرنے ہی والا تھا کہ مین ہول کے آخری سرے پر مجھے روشنی کی ایک ہلکی جھلک نظر آئی۔

روشنی کی یہ ہلکی سی کرن دیکھ کر میرے رگ وپے میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی اور اطراف کی ہر چیز سے بے نیاز ہوکر میں اس جانب اندھادھند دوڑنے لگا۔ یہ سیوریج لائن کے اوپر کی جانب کھلتا ہوا دہانہ تھا۔ جس سے باہر کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آرہی تھی۔

گیارہ سال کے بعد یہ میری آزادی کا بس ایک لمحہ تھا۔ اوپر نیلگوں' بیکراں آسمان کی چادر تنی تھی. اور دن کی دھوپ میں ہر چیز خوش رنگ اور دلکش نظر آرہی تھی۔ میں گیارہ سال کی قید تنہائی کی اذیتوں کو بھول چکا تھا۔ بس صرف یہ احساس باقی رہ گیا تھا کہ میں آزاد ہوں۔ گو میرے کپڑے تار تار ہوچکے تھے ۔ اور جسم کے مختلف حصوں پر لگے ہوئے زخموں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ مگر خود کو آزاد فضاء میں پاکر ہر قسم کے اذیت ناک احساسات سے بے نیاز ہوچکا تھا۔

یہ میری آزادی کا بس ایک لمحہ تھا میرے سر کے اوپر نیلگوں آسمان کی وسیع چھت اور پاؤں کے نیچے زمین کی نرم اور گیلی مٹی تھی۔ میں اپنے پھیپھڑے کی پوری طاقت سے چلایا

"یہ میرا اپنا لمحہ ہے 'آزادی اور خود مختاری کا' اسے مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا۔"

چند لمحوں کے بعد میں دوبارہ نگہبانوں کے غضبناک نرغے میں تھا۔ جنہوں نے اس لمحہ کے سوا مجھے سب کچھ دے رکھا تھا۔ ساری نعمتیں 'ساری آسائشیں..... بس وہ لمحہ نہیں جو' ان کے نزدیک سنگین جرم ہے۔ قابل سزا۔

یہ ایک ایسا قیمتی راز ہے جو صرف میں ہی جانتا ہوں۔ وہ اس راز کی تہہ تک کبھی نہیں پہنچ پائیں گے جسے میں حاصل کر چکا ہوں کہ میں اس ایک لمحہ کے لئے ہمیشہ زندہ رہا اور اس ایک لمحہ کے سہارے قید کی صدیاں گزار دوں گا........."

اتھارٹی

اصل مسئلہ فیصلہ نہیں بلکہ اس پر عمل کرنے کا وہ ولولہ اور ارادہ ہے جو انسان کو اندر سے ہر دم اکسائٹ رکھتا ہے۔ فیصلہ تو میں ہمیشہ کرلیتا ہوں اور وقت پر ہی کرتا ہوں جو ذرا مشکل کام ہے، لیکن جب اس پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو ہر قسم کے تذبذب اور خوف کے بھنور میں پھنس جاتا ہوں اور نتائج کی تلاش میں مسئلے کی اہمیت اور شدت دونوں کو بھلا بیٹھتا ہوں۔

انسان متضاد خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ کبھی کبھی سب کچھ برداشت کرلیتا ہے اور کبھی معمولی بات مشکل سے برداشت کرپاتا ہے۔ اگر ذات میں تھوڑی بہت خودداری کا رنگ بھرا ہو تو HUMILIATION کو سہہ لینا کوئی آسان کام نہیں خاص طور سے مجھ ایسے SELF CENTERD کے لئے تو یہ موت اور زندگی کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس لئے میں نے تہیہ کرلیا ہے کہ آج کچھ نہ کچھ کرکے رہوں گا۔ آخر اپنی زندہ لاش کو پامال کرنے کی اجازت کب تک دوں گا۔

نئی اتھارٹی نے یہاں کا انتظام سنبھالتے ہی سب سے پہلے وہی کام کیا جسے سماجی زندگی میں بالعموم روایتی جبر کا نام دیا جاتا ہے۔ ہر ایک کی عزت نفس کو اتنا کچل دیا جائے کہ کوئی سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔ کیوں کہ مسائل ہمیشہ سر اٹھانے سے جنم لیتے ہیں۔

کھڑ کھڑاتی روٹا مشینیں اور چوڑے نالے کے بہتے ہوئے گندے پانی کے درمیان قدیم وضع کی عمارت کی دس اور بارہ سیڑھیوں کی پہلی اور دوسری قسطیں بھگتا کر جوں ہی اوپر پہنچا تو سیاہ نوٹس بورڈ پر آویزاں نئے اور تازہ حکم نامے کے سخت گیر لفظوں کے پھندے نے میری

پتلی سی گردن کو اپنے حلقے میں کس لیا۔ وہی تحکمانہ لہجہ' وہی تمسخر اور تضحیک کے گہرے نشتر دل میں اترتے ہوئے محسوس ہوئے۔ حکم نامے کے سیاہ غلیظ لفظوں کے بچھو ڈنک اٹھائے نوٹس بورڈ پر رینگ رہے تھے۔

مجھے پورا یقین ہے کہ مجھ سے پہلے بھی یہاں آنے والوں نے اس حکم نامے کے ایک ایک لفظ اور نقطے کو دیکھا اور پڑھا ہوگا۔ الفاظ کے زہریلے ڈنک کو اپنے وجود کے رگ و ریشے میں محسوس کیا ہوگا' مگر شاید اب وہ خوف اور ذلت کے اتنے خوگر ہو چکے ہیں کہ تحکم کے اس ڈنک کو اف کئے بغیر برداشت کرلیا ہوگا اور اپنے جھکے ہوئے کندھوں پر سر ڈالے اپنے اپنے شعبوں میں چلے گئے ہوں گے۔ جواب دینا یا سر اٹھانا شاید انہوں نے سیکھا ہی نہیں یا پھر بھول گئے۔

نئی اتھارٹی نے ادارے کا انتظام سنبھالنے کے فوراً بعد ملازمین کو نفسیاتی شاک پہنچانے کا جو پہلا کامیاب تجربہ کیا اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہی۔ ادارے کا نیا چیف جو اپنے گھٹے ہوئے سر' کوتاہ گردن اور بھدی ناک کے سبب طبعاً ضدی' سفاک اور خود غرض نظر آتا اپنے مشیروں کے ساتھ پہلی میٹنگ میں گول گول دیدے گھماتے ہوئے چلایا۔

"اتھارٹی کو پوری برو ٹلیٹی کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہئے۔ قوت وہ اہم عنصر ہے جس کے ذریعے ہم اپنے چھوٹے بڑے ہدف کو آسانی سے حاصل کرسکتے ہیں اور بتدریج کسی رکاوٹ کے بغیر اپنے اختیارات کا دائرہ وسیع کرسکتے ہیں۔ جو لوگ یہاں کام کرنے آتے ہیں ضروری ہے کہ ان کا سر ہمارے تحکم کے بوجھ سے سرنگوں رہے۔ جو چیز راستے میں آجائے اسے ہٹا دینا ضروری ہے۔"

پہلی منزل کے تنگ و تاریک کوریڈور میں پہنچتا ہوں تو سب سے پہلے میری ملاقات ان تینوں سے ہوتی ہے جو ہر روز میرے سلام کا جواب جان بوجھ کر آہستگی اور بڑی لجاجت سے دیتے ہیں کہ کہیں ان کے ساتھ والے وسیع اور منقش ایرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھا ہوا چیف نہ سن لے اور ان پر کوئی نادیدہ عتاب نازل نہ ہوجائے۔ وہ ہمہ وقت سر جھکائے کام میں معروف نظر آتے ہیں۔ صرف لنچ کے اوقات میں اٹھتے ہیں۔ باقی وقت وہ فائلوں میں غرق رہتے ہیں۔ کبھی کبھی جب سیلنگ کی گرم ہوا ناقابل برداشت ہوجاتی ہے تو وہ بے قابو ہو کر اپنے جسم اور چہرے سے پسینے کے قطرے پونچھنے لگتے ہیں۔ ان میں معمر شخص بہت دھیمے دھیمے لہجے میں

بڑبڑاتا۔

"اف خدایا۔ یہ گرمی تو مار ڈالے گی۔" پھر وہ بنیان اتار کر پسینہ نچوڑتا اور پنکھے کی گرم ہوا کے سامنے سوکھنے کے لئے ٹانگ دیتا۔ اس دوران صرف قمیض پہنے رہتا۔ میری طرف چوری چھپے دیکھ کر کہتا...

"اگر اس تنگ گلی میں (تنگ کوریڈور کو بند گلی کا نام دیتا ہے) مزید ایک پیڈسٹل فین لگا دیا جائے تو گرمی قابل برداشت ہو جائے' پھر دیکھئے نا اس سے ہماری EFFICIENCY کتنی بڑھ جائے گی"' دوسرا جملہ قدرے بلند آواز میں ادا کرتا تاکہ اس کی یہ التجا کسی نہ کسی طرح نئی اتھارٹی تک رسائی حاصل کرلے۔ مگر یہ اس کی حسرت ہی رہی نئی اتھارٹی کو کسی قسم کے شکوے سے کبھی کوئی دلچسپی نہ رہی۔

ٹھیک اس وقت میں لوہا گرم دیکھ کر ضرب لگاتا ہوں تو وہ مجھے اس طرح دیکھتا ہے جیسے میں اسے کنویں میں دھکا دے رہا ہوں۔ اس کی بیوی بچوں کو در در کی خاک چھاننے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ وہ میری بات سن کر بڑی عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر کہتا....

" خدارا ہمارے حال پر رحم کرو۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ مکان بھی میرا اپنا نہیں ہے۔ چیف کسی کا قصور معاف کرنا جانتا ہی نہیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو بھائی۔"

ایک وہی نہیں۔ ادارے کا کوئی شخص اپنا یا کوئی اجتماعی مسئلہ نئی اتھارٹی کے کمرے تک لے جانے کے لئے تیار نہیں۔ ان کے پاؤں کانپنے لگتے ہیں اور نگاہوں کے سامنے اندھیرا پھیل جاتا ہے۔

ادارے کے حالات دیکھ کر میرے اندر بغاوت اور نفرت کی آگ سلگتی رہتی' مگر مجھے اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا۔ جوں جوں حالات میرے قابو سے باہر نکلتے جا رہے ہیں۔ میرے اندر بھی ایک قسم کا خوف پنجے مار کر بیٹھنے لگا ہے۔ اگر میرے دل میں بھی خوف کے جمنے کا عمل اسی طرح جاری رہا تو ایک نہ ایک دن نئی اتھارٹی کے خلاف بغاوت کی چنگاری بھی بجھ جائے گی' جس نے اب تک مجھے اور بعد ازاں دفتر کے بعض دوسرے اہلکاروں کو اچھے دن کی آمد کی امید دلا رکھی ہے۔

کوریڈور میں بیٹھے ہوئے صوابی کے پٹھان ٹائپسٹ کو دیکھ کر مجھے اندھیرے میں ہمیشہ روشنی کی ایک جھلک نظر آئی۔ دراز قد اور مضبوط جسم کا جمیل خان۔ اس کی کھردری انگلیوں

کے دباؤ سے بعض اوقات ٹائپ رائٹر کے اسٹروکس ایک دوسرے پر چڑھ کر بیٹھ جاتے۔ اس کی آنکھیں کشادہ اور روشن تھیں۔ پاٹ دار آواز میں اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا ذکر کرتا تو مجھے ایک گونا اطمینان ہوتا۔ شاید جمیل خان ہی ہمارے حالات بدلنے کا وسیلہ بن جائے۔

ایک دن جب میں نے اس سے احوال پوچھا تو اس نے بڑی بیزاری سے جواب دیا۔

"چھوڑو صاحب' کیا خیریت دریت پوچھتا ہے۔ اتنے کم پیسوں میں بھلا کہاں گزارا ہوتا ہے۔ تہوار سر پر ہے۔ کب تک قرض سے کام چلے گا۔ بچے ملک جانے کے لئے الگ تنگ کررہے ہیں۔ آٹھ سال ہوگئے۔ انکریمنٹ تک نہیں لگا۔ لعنت ہے ایسی زندگانی پر۔"

میں نے لوہا گرم دیکھ کر ضرب لگائی۔ "اتھارٹی اس طرح ماننے والی نہیں۔ کچھ کرنا ہوگا ورنہ ساری زندگی تیرہ سو روپے میں گزر جائے گی۔"

"پھر کیا کرے صاحب' تم ہی کوئی راستہ بتاؤ۔"

"ایک ہی طریقہ ہے۔"

"وہ کیا صاحب؟"

"اتھارٹی سے کہا جائے وہ ہماری تنخواہوں میں اضافہ کرے۔ اگر وہ اپنے خاص خاص بندوں کو ترقی اور سہولتیں دے سکتا ہے تو پھر ہمیں کیوں نہیں دیتا۔ اس ادارے کی پوری عمارت ہمارے کندھوں پر کھڑی ہے۔"

"مگر اس سے بات کون کرے گا؟" اس کے پاٹ دار لہجے میں نادیدہ خوف کا عنصر رینگ آیا تھا۔

"ہم تم اور سارے لوگ۔ ہم سب ایکا کرکے اس سے بات کریں۔ وہ ہمیں اکٹھا دیکھ کر ہماری بات ضرور سنے گا۔"

"مشکل ہے صاحب..... بہت مشکل' وہ دوسروں کی بات سنتا ہی کب ہے۔ صرف اپنی کہتا اور اپنی سناتا ہے مغلظات الگ بکتا ہے۔ خنزیر کا بچہ....."

"کوشش کرتے ہیں' شاید راستہ نکل آئے۔"

" صاحب تم میری بات سنو' ہمارا ساتھ کوئی نہیں دے گا' چلیں گے سب ساتھ' مگر دروازے تک ہم صرف دو ہی رہ جائیں گے اور دو کو باہر نکالے جانے کا راستہ بہت آسان

ہو گا۔"

"اس طرح تو یہ معاملہ حل نہیں ہو گا۔" میں نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
"صاحب تم بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ اس طرح ہمارے حالات کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے، مگر تم جو راستہ بتاتا ہے اس سے حالات زیادہ بگڑ جائیں گے' روکھی سوکھی سے ہاتھ دھونا پڑے گا .مجھے تو معاف کرو صاحب۔ میری بڑی بچی کو خسرہ نکل آیا ہے اور وہ آج کل سخت بیمار ہے۔"

شام کا اندھیرا پھیلنے لگا ہے۔ درختوں کی موٹی موٹی شاخیں دھندلانے لگی ہیں۔ اس علاقے میں قدیم طرز کی بعض عمارتوں کے فٹ پاتھوں پر گھوڑے کی نال ٹھونکنے والے اپنے اوزاروں کے بکس سنبھال رہے ہیں۔ جب پر شور گندے نالے اور کھڑکھڑاتی مشینوں کے درمیان پرانی وضع کی پھیکی اور بے رنگ عمارت کی سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچوں گا. تو راستے کی ان تمام چیزوں سے مڈبھیڑ ہوگی۔ پیشاب زدہ فٹ پاتھ' درختوں کے گھنے جھنڈ اور گھوڑے کی بدبودار لید اور میں آج بھی ہمیشہ کی طرح دل میں بسی رہنے والی اداسی اور نفرت کی آگ کو دبائے معمول کے مطابق گزر جاؤں گا۔
سیڑھیوں کی پہلی قسط ادا کر کے نیچے اترتا ہوں تو کالے رنگ سے روغن کیا ہوا وہ نوٹس بورڈ ایک بار پھر میری نگاہوں کے سامنے میرے سارے وجود کو للکارنے کے لئے موجود ہے۔ تازہ ترین حکم نامے کے بچھو ابھی تک ڈنگ اٹھائے رینگ رہے ہیں۔
میں کچھ توقف کرنے کے بعد ادھر ادھر دیکھتا ہوں۔ بعض کمروں کی بتیاں ابھی تک جل رہی ہیں اور بعض شعبوں کے دروازوں پر تالے پڑ چکے ہیں۔ نسوار کی چٹکی لے کر چوکیدار دروازوں کے تالوں کو چیک کرتا ہوا میرے سامنے سے گزر چکا ہے۔ شاید میں اسی لمحے کے انتظار میں یہاں کھڑا ہوں۔ میں پھرتی سے نوٹس بورڈ پر جھپٹا مارتا ہوں اور تازہ حکم نامے کے بچھوؤں کا سر کچل کر اندھیرے میں سیڑھیاں اتر جاتا ہوں۔

دو حصوں میں بٹا ہوا جسم

بہت سے چہروں کے درمیان جب کوئی چہرہ جس کی پہچان مشکل سے کرپاتا ہوں میرے آدھے وجود کے ملبے کے قریب آکر تسلی دیتا ہے۔

"چپ کرو... ایسا ہوتا آیا ہے.... اور ایسا ہوتا رہے گا...." تو یہ الفاظ مجھے مزید بے یقینی کے وسیع صحرا کی جانب لے جاتے ہیں۔ جہاں دور دور تک زندگی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔ سوائے اس کے کہ آوارہ پھرتے ہوئے ریت کے بگولوں میں میرا نصف وجود بھی گم ہوتا نظر آتا ہے۔ میرا واہمہ یقین میں بدلنے لگتا ہے کہ ان چہروں نے بالآخر مجھ پر فتح پالی اور اب وہ کانٹے دار ببولوں سے گھرے ہوئے کسی تاریک اور ویران غار میں مجھے اتار کر کرسیوں پر اطمینان سے فارغ بیٹھے ہیں۔

"گویا ان چہروں نے مجھ سے بھی چھٹکارا حاصل کر ہی لیا"

"آخر یہ کون ہے جس کا تم اتنی دیر سے ماتم کر رہے ہو...." کچھ دیر خاموشی کے بعد پھر وہی آواز..... "قبر تازہ ہے اور پھولوں کی چادر بھی۔ اگربتی کی خوشبو ہوا کے ساتھ چاروں طرف پھیل رہی ہے..... یقیناً کوئی رشتے دار ہے..... بہت عزیز ہے نا..... میرا خیال کبھی غلط ثابت نہیں ہوتا۔ کیوں کہ میں صدیوں سے یہاں آتا جاتا رہتا ہوں۔ میری معلومات یہاں کے کبڑے پیشہ ور گورکن سے کہیں زیادہ مصدقہ ہیں جس کا کام صرف قبریں تیار کرنا اور رجسٹر میں خانہ پری کروانا ہوتا ہے۔ کبھی تم نے اس کے چہرے پر کوئی ملال دیکھا ہے یا کسی کے غم میں دو آنسو بہاتے یا ہمدردی کے دو بول کہتے سنا ہے۔ وہ تو قبرسازی کے روپے کھرے کرکے اپنا پھاوڑا اور پانی کا کنستر اٹھا کر کسی نئی قبر کی تیاری میں عجلت سے چل دیتا ہے۔ اس

کا یہ سارا عمل میکانکی اور غیر جذباتی ہوتا ہے۔ اسے اتنی فرصت کہاں کہ وہ تمہارے یا کسی کے غم میں اپنا وقت ضائع کرے۔ اس لئے ذرا صبر سے کام لو' اور مجھے بتاؤ کہ تمہارا اس نئی قبر کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔ میرا کسی قبر کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے۔ مگر میں ہر نئی قبر کے رشتے داروں کے چلے جانے کے بعد آہ وزاری کرتا ہوں تاکہ قبر کے اندر جو کوئی بھی ہو اسے اس بات کی تسلی رہے کہ رشتہ داروں کے بے صبری سے چلے جانے کے بعد بھی کوئی تو موجود ہے۔ اچھا چلو۔ اب تم یہ بتادو کہ اس تازہ قبر کے اندر کفن میں لپٹی ہوئی لاش سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟

"تو پھر تم نے کیا جواب دیا....." عائشہ نے بالکل اسی انداز میں اپنے کولہے پر ایک ہاتھ رکھ کر سوال کیا تھا۔ جس طرح اس نے کارڈیو کے نارتھ وارڈ میں پہلے دن دریافت کیا تھا..... یہ تمہاری کون ہے؟"

"ماں....." اور میں نے اسے جواب دیا۔

"ہاں ذرا غور سے سن لو' یہ میں ہوں..... یہ میں ہوں.........." میرے رشتے دار جلدی جلدی مجھے قبر میں اتار کر یہاں سے چلے گئے کیوں کہ انہیں خوف تھا کہ اگر دس بج گئے تو کرفیو لگ جائے گا' اور پھر وہ پھنس کر رہ جائیں گے۔

جب میں نے انہیں ٹیلیفون پر اطلاع دی تھی تو انہوں نے تسلی سے زیادہ تشویش ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔ سارا کام تیزی سے نمٹانا کیوں کہ دس بجے کرفیو لگ جائے گا۔

"اچھا تو اس نئی قبر میں جس کو اتارا گیا ہے وہ تم ہو..... اور تمہارے رشتے دار جیسے سب کے رشتے دار اپنے کندھوں کا بوجھ ہلکا کر کے چلے جاتے ہیں..... تمہیں بھی تنہا چھوڑ کر چلے گئے....."

"ہاں جب سے میرا وجود دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا ہے.... ایک حصہ قبر کے اندر ہے..... دوسرا باہر..... ماتم کناں....."

"موت کے گہرے سکوت اور زندگی کے شعور کے درمیان یہ فاصلہ تو باقی رہتا ہے..... کیکر اور ببول کی جھاڑیوں کے درمیان مٹی مٹی' ابھری ابھری قبروں کے اطراف موت کا یہ گہرا سناٹا' پر ہول خاموشی اور کبھی نہ ختم ہونے والے سکوت کا زور نہیں ٹوٹتا..... زندگی اور موت کے درمیان یہ فاصلہ تو ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا....."

"اچھا سنو اگر تم جانا چاہو تو چلے جاؤ' کرفیو لگنے میں ابھی کچھ دیر ہے..... شاید کچھ لوگ گھر پر تمہارا انتظار کر رہے ہوں....."

"میں یہاں خود کو تنہا چھوڑ کر چلا جاؤں..... بھلا کیسے.....؟"

عائشہ میری ماں کے بیڈ کے ساتھ آکر کھڑی ہو گئی تھی..... سانولا رنگ' بڑی بڑی سیاہ آنکھیں' آواز میں کورے گھڑے کی ٹھنڈک..... وہ نواب شاہ کے کسی گوٹھ کی رہنے والی تھی..... ہفتے عشرے میں اس کے دل کے دو VALVE کا آپریشن ہونے والا تھا۔ وہ آپریشن سے زیادہ وارڈ کے معمول اور یکسانیت سے خوف زدہ تھی۔ اس نے بیڈ کے قریب کھڑے ہو کر دیہقانی انداز میں سوال کیا تھا۔

"کیا طبیعت زیادہ خراب ہے اماں جی کی....."

"ہاں..... بہت زیادہ..... خون کی فوری ضرورت ہے....."

"تو پھر ڈاکٹر خون کیوں نہیں دیتے.....؟"

"میری ماں کے خون کا گروپ نہیں ملتا....."

"میرا دیکھ لو جی..... شاید مل جائے....."

یہ وارڈ میں ہماری دوسری ملاقات تھی.....۔ تیمار دار بہن نے بتایا تھا کہ بہت غریب لڑکی ہے۔ اس کی ماں اس کے علاج کے لئے نواب شاہ سے لے کر آئی ہے اور اس نے خود کلفٹن میں کسی زردار کے بنگلے پر ماسی کا کام سنبھال لیا ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ عائشہ کے ٹھیک ہونے تک وہ اسی طرح گزارا کرے گی۔ عائشہ کی ماں اس کے لئے بہت پریشان اور غم زدہ تھی۔

قبرستان کا سوگوار سناٹا' تھکن اور تنہائی کا احساس بڑھا دیتا ہے۔ دفنانے کا زیادہ تر کام تو گور کن اور محلے داری کے جذبے سے سرشار بعض نوجوان پیش پیش رہ کر انجام دے لیتے ہیں..... مگر وہ جو رسومات کی ادائیگی میں مطلق دلچسپی نہیں لیتے' اور آخری وقت تک ادھر ادھر ٹولیوں میں بٹ کر سماجی رتبے اور حیثیت پر تبادلہ خیال کرتے رہتے ہیں وہ بھی واپسی پر تھکن محسوس کرنے لگتے ہیں..... اکثر جب میں قبر پر کنستر سے میٹھے پانی کا چھڑکاؤ کرنے کے بعد اگر بتیاں سلگانے میں مصروف رہتا ہوں تو مجھ پر اس قسم کے خیالات کی یلغار رہتی ہے۔

یہ سناٹا' یہ پھیلی ہوئی خاموشی ہی تو وہ برہنہ صداقت ہے جو ہمیں زندگی کی چہل پہل سے

بد گمان کرتی ہے۔ جب ادھر آنا ہی ٹھہرا تو خود کو رنگ وبو کے سیلاب میں غرق کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

عائشہ گراؤنڈ فلور پر ملی تھی جب ہم اماں کو اسٹریچر پر ڈال کر دوسرے ہسپتال لے جانے کے لئے ایمبولینس میں منتقل کر رہے تھے۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں نمی تھی۔

"اماں، اچھی لگتی ہے جی..... گڑیا جیسی..... میں بھلا کیسے بھلا سکوں گی..... اچھی ہو جائے تو نواب شاہ ضرور لانا..... میں انتظار کروں گی.........."

ریت کے ٹیلوں اور کیکر کی جھاڑیوں کے درمیان مٹی کے ڈھیروں میں تبدیل ہوتی ہوئی بے ترتیب قبروں کے برابر اس قبر کے سرہانے جس کے اندر میرے وجود کا نصف حصہ دفن ہے۔ اکثر سوچتا ہوں۔

میں سب کچھ اس کے اندر ہوں..... یا کچھ باہر بھی رہ گیا ہوں..... کیا موت سب کچھ نگل لیتی ہے یا وجود کا کچھ حصہ ایسا بھی ہے جس پر وہ قابو پانے سے رہ جاتی ہے۔

ایمبولینس روانہ ہوئی تو عائشہ نے ماں کے بے حس و حرکت پاؤں پر اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے کہا..... "ماں تو سدا جیوے....." اس کی آواز بھر آگئی تھی۔

ریمیڈیل کے ڈاکٹر نے مجھے الگ لے جا کر بتایا.....

"آپ کی والدہ کو جنرل وارڈ سے آئی سی یو، میں منتقل کر رہے ہیں....."

"کیوں! کیا بات ہے.....؟"

"الارمنگ، ہم انہیں بچانے کی بھرپور کوشش کریں گے....."

انہوں نے دوسری صبح ماں کی لاش ہمارے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"SORRY"

تو موت سب سے بڑی صداقت ہے۔ پھر اس زندگی کو کیا نام دیا جائے؟

جھینگروں کی جھائیں جھائیں اور پیٹرومکس کی تیز ہوا سے پھڑپھڑاتی ہوئی روشنی میں میرے وجود کے حصے کو قبر میں اتار کر سیمنٹ کی بڑی بڑی سلیں چن دی گئیں۔

گورکن نے بیلچے سے جلدی جلدی اطراف میں جمع مٹی کے ڈھیر کو قبر میں ڈالنا شروع کیا..... قبر کا پیٹ ریت اور مٹی سے بھر کر ابھر آیا۔ پھر اس نے ہانک لگائی۔

"مٹی ڈالو بھائیو....."

جب سارے رشتے دار اور احباب دو دو مٹھی مٹی ڈال کر فاتحہ خوانی سے فارغ ہوئے تو انھوں نے اطمینان سے سانس لیا۔ اور اپنی اپنی گاڑیوں میں اپنے گھر چلے گئے۔

سیاہ پہاڑی کے دامن میں قبرستان کا سناٹا زیادہ گہرا اور معنی خیز ہو گیا۔

تیز ہوا۔ لمبی لمبی نوک دار جنگلی گھاس کے درمیان سے گزرتی ہوئی سرسراہٹ پیدا کر رہی تھی۔ یہ قبرستان کی اپنی غیر مانوس آواز تھی..... مخصوص آواز' پر اسرار سوگوار اور ہیبت ناک....."

"تو گویا سب چلے گئے....."

"ہاں سبھی تو ایک ایک کر کے....."

قبرستان کے سناٹے میں صرف میرا نصف وجود اندر اور نصف باہر رہ گیا ہے.... بے یقینی کے تپتے صحرا میں تنہا اور خوفزدہ۔

"یہ تمہاری کون ہے....؟"عائشہ نے بیڈ کے قریب آتے ہوئے بالکل دھقانی لہجے میں سوال کیا۔

"ماں......"

جب ہم ہسپتال سے روانہ ہو رہے تھے تو عائشہ گراؤنڈ فلور پر ملی تھی۔ اس نے میری ماں کے پاؤں پر اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے کہا تھا۔

"اماں.... تو سدا جیوے...."

میرے تنہا اور خوف زدہ نصف وجود کے گنبد کے سناٹے میں صرف عائشہ کی گونج باقی رہ گئی ہے۔

میت گاڑی کاڈرائیور الف

سائرن کی مسلسل چیخوں سے دو ہی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ایک تو یہ کہ ایمبولنس میں دل کے کسی قریب المرگ مریض کو ہنگامی حالت میں کارڈیو لے جایا جا رہا ہے یا پھر دل و دماغ میں جو دوسری بات اَنی بن کر اترتی ہے وہ یہ کہ کسی سماجی ادارے کی میت گاڑی نے لاشیں ڈھونے کا کام شروع کر دیا ہے۔

میں مسمی "الف" ان چند ڈرائیوروں میں شامل ہوں جو لاشیں اٹھانے یا کسی قریب المرگ مریض کو ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچانے کا کام کرتے ہیں۔ان دنوں یہی میرا پیشہ ہے اور ایک بڑے کنبے کا کفیل ہوں۔میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ مجھے لاشیں اٹھانے کے کام سے شدید نفرت ہے۔اس لئے نہیں کہ لاشیں اٹھانا کوئی گندہ یا قابل نفرت کام ہے' بلکہ اس لئے کہ رواں دواں زندگی کو ساکت اور جامد شکل میں دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔دوڑتی بھاگتی شور مچاتی 'گاڑی کے مضبوط پہیئے کی طرح' آگے کی جانب فراٹے بھرتی ہوئی زندگی..... روشن اور خوشبودار۔

کیا کبھی آپ نے قریب سے کسی لاش کے چہرے کا نظارہ کیا ہے۔کسی حادثے کا شکار انسانی چہرہ کٹی پھٹی پھولی ہوئی' دھندلی اور بے رونق آنکھیں اور اس پر منجمد خون کی سیاہ کھرنڈ ... ان آنکھوں کے سارے خواب مردہ ہو چکے ہوتے ہیں جو اسے موت کے گہرے سکوت سے پہلے سرگرم اور توانا بنائے رکھتے ہیں۔زندگی کی گہما گہمی اور چہل پہل میں ہمہ وقت شامل رہنے کی دعوت دیتے رہتے ہیں۔

آپ میرا اصل نام ضرور جاننا چاہیں گے کیونکہ میں نے شروع میں اپنے نام کی جگہ الف

استعمال کیا ہے۔ آپ تھوڑا سا حیران بھی ہو رہے ہوں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ اب نام اور لفظ اپنی حرمت کھو رہے ہیں۔ نام تو پہچان اور شناخت کے لئے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے قریب آنے اور قریب کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں، مگر اب شناخت کی یہ روایت دم توڑتی جا رہی ہے۔ دشمنی خروج کی دہشت میں بدل چکی ہے۔ سو نام بتانے میں کیا رکھا ہے۔ غالباً آپ میرا اشارہ سمجھ چکے ہوں گے۔ لوگ خوف سے اپنا اصل نام چھپاتے ہیں یا بدل دیتے ہیں۔ جو لوگ یہ گُر استعمال کرنا ابھی تک نہیں جان پائے ان کی لاش دوسرے دن کسی گمنام علاقے کی کسی جھاڑی سے برآمد ہوتی ہے۔ بعد ازاں شناخت نہ ہونے کی صورت میں ہمیں وہ لاش ٹرسٹ کے قبرستان میں کسی کتبہ کے بغیر مٹی کے نیچے دبانی پڑتی ہے۔

آپ فرض کرلیں کہ میرا نام الف ہی ہے اور ایک بڑے کنبے کا کفیل ہوں۔ پہلے میں ایک ادویہ ساز کمپنی میں فرض شناس، ڈرائیور تھا۔ فرض شناس اس لئے کہ مشکل سے ڈیوٹی سے غیر حاضر رہتا۔ لیکن اس بڑی کمپنی میں چھوٹے ملازمین کو چھوٹی چھوٹی تنخواہ ملتی۔ الاؤنسز اور اوور ٹائم کا رواج نہ تھا۔ اس کسمپرسی کے عالم میں میرے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ "سرکاری ٹرانسپورٹ میں بھرتی کا اعلان ہوا ہے تم بھی فائدہ اٹھاؤ روڑا لگانے کا خوب موقع ملتا ہے۔" چنانچہ میں سرکاری ٹرانسپورٹ میں بطور ڈرائیور بھرتی ہو گیا، مگر چونکہ میں بنیادی طور پر ایک، ایماندار، اور فرض شناس، آدمی ہوں اس لئے سرکاری ٹرانسپورٹ میں زیادہ دیر نہیں چل سکا۔ چند ہی مہینوں میں راشی کنڈکٹروں اور ٹائم کیپروں نے ملی بھگت کر کے مجھے وہاں سے چلتا کیا۔

اب میرے سامنے بھوک اور بیروزگاری کے طویل اور تلخ دن تھے ان دنوں میں نے ایمانداری اور فرض شناسی جیسے لفظوں پر بڑا غور و فکر کیا میری بڑی لڑکی 'ش' کا نام اسکول سے بار بار کٹا جو کنٹونمنٹ کے ایک گرلز ہائی اسکول میں نویں کی طالبہ تھی۔ بے حد سگھڑ اور ذہین تھی۔ وہ اکثر میرے سامنے کھانے کی رکابی اور تانبے کے گلاس میں ٹھنڈا پانی رکھتے ہوئے ڈھارس بندھاتی۔

"بابا! تم زیادہ فکر نہ کیا کرو، میٹرک کر کے محلے کے کیمونٹی سنٹر میں ملازمت کرلوں گی۔ تمہارا کچھ تو بوجھ ہلکا ہوگا۔" یہ میری بیٹی 'ش' تھی جو ہمیشہ زندگی کو رواں دواں رکھنے پر بضد تھی۔ دوسرے بچے ذرا کمسن اور اتنے سمجھ دار نہ تھے جو میری پریشانی سمجھ پاتے۔ اس طرح

میری بیٹی میرا بیٹا بن گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوابوں کا پڑاؤ دیکھ کر میری آنکھوں میں بھی خواب اتر آتے۔ زندگی کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے کا خواب۔ وہ میری زندگی کی گاڑی کا دوسرا مضبوط پہیہ بننا چاہتی تھی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں تیرنے والے خوابوں سے محبت ہو گئی۔

انہی دنوں میرے ایک واقف کار نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی اور مجھے شہر کے ایک سماجی ادارے کے منیجر کے پاس لے گیا۔ انہیں ایمبولنس اور ضرورت پڑنے پر میت گاڑی کے لئے ایک تجربہ کار ڈرائیور کی ضرورت تھی میرا ٹرائل ہوا اور میں ان کی توقع پر پورا اترا انہیں ایک شریف اور حاجت مند مل گیا تھا۔

کنٹریکٹ لیبر پر کم و بیش ایک سال پانچ ماہ تک کام کرتا رہا۔ مشکل سے گھر کا خرچ چل رہا تھا مگر بے کار بیٹھے رہنے سے یہ کام اچھا تھا۔ البتہ زندہ لوگوں کی بستی میں لاشیں ڈھونے کے کام سے نفرت بڑھتی گئی۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا جب فون کی گھنٹی نہ بجتی اور میں گاڑی لے کر نکل نہ پڑتا کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے ایک دن یہ جیتی جاگتی بستی لاشوں کا شہر بن جائے گی۔ ہر طرف موت کا سناٹا اور ہولناک ویرانی پھیلی ہوگی...... گلی سڑی، کٹی پھٹی لاشیں اور دھواں دھواں آنکھیں جنہیں دیکھ کر میں خوف کے دلدل میں گلے گلے ڈوبتا ہوا محسوس کرتا۔ لاش دیکھ کر بس ایک ہی خیال ذہن میں ابھرتا اسے ابھی مرنا نہیں چاہئے تھا۔ پتہ نہیں ان آنکھوں نے کیا کیا خواب دیکھے ہوں گے!

شہر کے حالات جب بھی مخدوش ہوتے ٹرسٹ کی ایمبولنس اور میت گاڑی کا کام بڑھ جاتا کبھی کبھی تو ۲۴ گھنٹے کام کرنا پڑتا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی کے ساتھ ہی سائرن کی دلخراش چیخیں شروع ہو جاتیں اور ہماری گاڑیاں شہر کی مختلف سمتوں میں روانہ ہو جاتیں کم از کم میری یہی کوشش ہوتی کہ وقوعہ پر بروقت پہنچ جاؤں اور زندہ آنکھوں میں پلنے والے خوابوں کو بچالوں

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ گاڑی کا ایک ٹائر برسٹ ہو گیا۔ دوسرا ٹائر بدلنے میں نصف گھنٹہ صرف ہو گیا، جب وقوعہ پر پہنچا تو زخمی دم توڑ چکا تھا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہ تھا مگر میرا ضمیر ملامت کرتا رہا کہ بروقت کیوں نہ پہنچا۔ نوجوان کی موت میرے ضمیر کا زخم بن گئی۔ میری بیٹی نے ڈھارس بندھاتے ہوئے تسلی دی۔

" آئندہ گاڑی نکالتے وقت چیک کر لیا کرو بابا! راستے میں گاڑی خراب ہو جائے تو بڑی

مصیبت ہو جاتی ہے۔"

ہمارا کام مشکل اور دہشت طاری کر دینے والا تھا۔ پتہ نہیں کیوں یہ کام کرتے ہوئے سال سے اوپر ہو چکا تھا مگر میں خود کو خوف کے اس اثر سے چھٹکارہ نہیں دلا سکا جو میرے چاروں طرف موجود تھا۔ کبھی کبھی ہمارا کام زیادہ صبر آزما ہو جاتا لاشیں سمیٹتے سمیٹتے ہمارے ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے بعض اوقات تو سڑی ہوئی لاشوں کی بدبو سے ہمارا دماغ پھٹنے لگتا۔ پھر تو ناک منہ پر کپڑا باندھ کر کام کرنا پڑتا۔ پھر بھی بدبو ہمارے دل و دماغ میں پنجے گاڑ کر اس طرح بیٹھ جاتی کہ ہفتوں باہر نہ نکلتی اور میرا کھانا پینا حرام ہو جاتا۔ دوسرے ڈرائیور میرا مذاق اڑاتے۔

"اب تو تمہیں عادی ہو جانا چاہئے۔ یہ تو روز کا کام ہے دلدار۔"

وہ شاید اتوار کا دن تھا۔ جب فون کی گھنٹی بجی، کوئی بڑے اور ہولناک حادثے کی خبر تھی شام تک ۱۳۶ لاشیں اٹھانی پڑیں۔ گنتی تو بظاہر تھی، ورنہ کچھ پتہ نہیں تھا وہاں کتنی لاشیں پڑی تھیں۔ میں تھک کر چور ہو چکا تھا۔ تین بار الٹیاں بھی آئیں، میرے پیٹ سے پانی کے سوا کچھ نہ نکلا کیونکہ صبح چائے پینے کا موقع بھی نہ ملا تھا۔ ہر طرف انسانی اعضاء بکھرے ہوئے تھے۔ کوئی لاش صحیح سالم نہ تھی۔ اس واردات کے لئے انتہائی خطرناک اور آتشیں اسلحہ استعمال کیا گیا تھا۔ کون سا عضو کس لاش کا تھا، شناخت کرنا مشکل کام تھا شاید ایسا ہی کوئی منظر تھا جسے دیکھ کر سامراٹ اشوک زندگی سے تائب ہو گیا، اور راج پاٹ چھوڑ کر بدھ پرچارک بن گیا۔ ہم الل ٹپ لاش کے ساتھ کٹے ہوئے اعضاء اٹھا کر میت گاڑی میں ڈال دیتے۔ ٹرسٹ کے قبرستان میں پہلے سے موجود چند کارکن بے دلی سے لاشوں کو مٹی میں دبانے کے کام میں مصروف تھے۔ ہر پھیرے میں یہ سوال ضرور کرتے۔

"اور کتنے بچے ہیں؟"

لاشیں اٹھانے اور اعضاء سمیٹنے کے دوران میری یہی کوشش رہی کہ کسی لاش کے چہرے یا اس کی آنکھوں پر نگاہ نہ پڑ جائے۔ چونکہ میرے ذہن پر ایک قسم کا نفسیاتی دباؤ موجود تھا، اس لئے اکثر گڑبڑ ہو جاتی اور میری نگاہ کسی نہ کسی مقتول کی کھلی ہوئی آنکھوں پر پڑ جاتی۔ وہی بے رنگ و نور آنکھیں، زندگی سے خالی، دھواں دھواں جن کے خواب بھی مقتول نظر آتے۔ مجھے بڑے زور سے متلی آجاتی اور میرا دوست مجھے الگ لے جا کر میری پیٹھ زور زور سے

سہلانے لگتا۔

"ابے کیا عورتوں کی طرح اوں 'اوں کئے جا رہا ہے 'مرد بن مرد۔"

وقوعہ کی جگہ میرے گھر سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھی کیکٹس اور ببول کی جھاڑیوں سے بھرے ہوئے وسیع میدان کی دوسری جانب زندہ انسانوں کی کچی بستی تھی جن کے بے شمار کچے مکانوں میں سے میرا بھی ایک کچا مکان تھا۔ دروازہ اتنا ناپائیدار اور کمزور تھا کہ اندر اور باہر سے کنڈی لگانے کے باوجود دھکے سے کھل جاتا۔ اس بستی کے مکانوں کے سارے دروازے ایسے ہی تھے۔ کمزور اور ناپائیدار...... میرا دل بار بار تڑپا گھر سے ہو آؤں 'ایک نظر بیوی بچوں کو دیکھ لوں 'کچھ ڈھارس بندھ جائے گی۔ یقین کیجئے یہ منظر دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا آج کوئی بچا نہ ہوگا 'کوئی نہیں بچ پائے گا۔ بس یہ زندگی اور خوابوں کا آخری دن تھا۔ ہماری گاڑیوں پر بھی تین بار حملے ہوئے 'حالانکہ ان پر ٹرسٹ اور ہلال احمر کے نشان بھی لگے ہوئے تھے۔ ان حملوں میں ہم بال بال بچے تھے۔

میت گاڑی کے آخری پھیرے میں ہمیں کسی لڑکی کا صرف ایک بازو ملا 'جس کی سانولی سلونی کلائیوں میں کانچ کی ہری ہری چوڑیاں خون میں دھل کر سیاہ پڑ گئی تھیں۔ میں نے کٹے ہوئے اس بازو کو لٹھے کے سفید کپڑے میں لپیٹ کر گاڑی میں ڈال دیا۔ شاید اس کے جسم کے دوسرے اعضاء دوسری لاشوں اور اعضاء کے ساتھ مٹی کے نیچے دبائے جا چکے ہوں گے۔

رات ۲ بجے گھر واپسی ہوئی 'ٹرسٹ والوں نے گاڑی گھر لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ بستی میں ہو کا عالم تھا۔ درودیوار پر خوف کے سائے منڈلا رہے تھے۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو بیوی بد حواسی کے عالم میں چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئی اور بچے آہ وبکا کرنے لگے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے اوسان بحال کرتے ہوئے سوال کیا۔

"آخر ہوا کیا کچھ بتاؤ تو سہی۔"

بیوی نے کانپتی ہوئی بھیگی آواز میں بتایا۔

"ہماری 'ش 'اسکول سے گھر واپس نہیں آئی۔ جانے وہ کہاں رہ گئی....؟

گمشدہ جزیرہ

اس نے بے قراری کے عالم میں اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا تھا اور تپتی ہوئی ریت پر گھٹنوں کے بل جھک گئی تھی۔ اس کے سر کے ٹھیک اوپر طباق سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور وہ مسلسل ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھی۔

"خدارا، بس کرو، میں اور اذیت برداشت نہیں کر سکتی۔ رحم کرو، دو گھونٹ پانی پلا دو۔"

اس کے گریہ کے جواب میں اس پر جھکے ہوئے مسخ چہروں نے زوردار وحشیانہ قہقہہ لگایا۔

"تم بہت پیاسی تھیں نا، دیکھو تو ہم پیاسی زمین کو کس طرح سیراب کر رہے ہیں۔ ہو۔ ہو ۔ہا۔ہا۔ہاہا۔" مسخ چہرے اس پر اور جھک گئے اور وہ دیوانہ وار چلا اٹھی "خدارا مجھے بچاؤ یہ درندے میری بوٹیاں نوچ لیں گے میرا خون پی جائیں گے۔ مجھے بچالو، بچالو۔"

"آنکھیں کھولو۔ مہرالنساء، اب تم ٹھیک اور خطرے سے باہر ہو۔"

ڈاکٹر کے ہاتھوں کا مانوس لمس اپنی پیشانی پر محسوس کر کے اس نے آنکھیں کھول دیں خوف اور دہشت سے اس کا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا۔ اور جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے ماحول کا بغور جائزہ لیا۔ وہ ہسپتال کے اسپیشل وارڈ میں تھی اس کے قریب ہی فربہ نرس سرنج میں دوا بھر رہی تھی، ڈاکٹر نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس کی کلائی کی نس میں سوئی اتار دی۔ اس نے غنودگی کے عالم میں ایک بار پھر معالج کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھا جو پانی کی سطح پر ہلکورے لے رہا تھا۔ اس کے کانوں اور ذہن کے پردے پر ڈاکٹر کی آواز ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھی۔

"اب تم خطرے سے بالکل باہر ہو' بس ذرا احتیاط اور آرام کی ضرورت ہے۔ دو ایک دن میں تم تکیہ لگا کر بیٹھنے کے قابل ہو جاؤ گی' ہمت کی بات ہے سمجھی نا۔"

ڈاکٹر کی آواز پھیلتے اور سکڑتے ہوئے صحرا کی وسعتوں میں ڈوب چکی تھی اور وہ ایک بار پھر طویل اور تھکا دینے والے سفر پر روانہ ہو چکی تھی' تنہا' خوف زدہ اور درماندہ اس کے چاروں طرف گرم گرم ریت کا خوف زدہ کرنے والا پھیلاؤ تھا اور سر پر چمکتا ہوا سورج اسکے ننگے جسم پر شعلوں کی بارش کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر صحرا کی پیاس تڑپ رہی تھی۔

"پانی پانی۔" اس کے سامنے میٹھے اور ٹھنڈے پانی کا چشمہ جھلملا رہا تھا۔ مگر جب وہ اس کی جانب لپکتی تو وہ غائب ہو جاتا۔

"خدا کے لئے مجھے دو گھونٹ پانی تو پلا دو۔" اس کی آواز میں التجا اور بے بسی تھی اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی نرس نے اسے پانی پلانے کے بجائے کپڑے کا چھوٹا سا ٹکڑا پانی میں بھگو کر اس کے خشک ہونٹوں کو تر کر دیا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں اپنے خشک ہونٹوں پر پانی کا ہلکا سا ذائقہ محسوس کر کے تیزی سے زبان پھیرنے لگی۔ اس کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔

"خدارا بس کرو..... میں تھک کر چور ہو چکی ہوں' میرے جسم کا ایک ایک حصہ ٹوٹ کر الگ ہو جائے گا۔ مجھے جانے دو۔ مجھے جانے دو ورنہ...... میں چیخ چیخ کر ساری دنیا کو اکٹھا کر لوں گی۔"

مسخ چہروں کا ہجوم ایک بار پھر اس پر جھک آیا۔ عجیب و غریب ڈریکولین چہرے جن کے دہانوں سے سرخ خون کی پتلی لکیریں جاری تھیں۔

"ضرور چیخو' مگر خیال رہے تمہاری چیخ خود تمہاری رسوائی کا سبب بن جائیگی۔ لوگ گواہی دیں گے۔ اس فلیٹ میں تم اپنی مرضی سے اپنے دوست کے ساتھ آئی تھی۔ تمہیں کسی نے یہاں آنے پر مجبور نہیں کیا۔" مسخ چہروں کے دہانے کھل گئے اور زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ "ہا۔ہا۔ ہو ہو۔ ہی ہی۔"

اس کے رگ و پے میں سورج کی تپش اور ریت کے آتشی ذرات گردش کرنے لگے اور ایک بار پھر وہ جسم و جاں کی ناقابل بیان اذیتوں میں گھر کر چلا اٹھی۔

"مجھ پر رحم۔ پیاس سے میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے جانے دو۔ خدا کے لئے۔"

"کھیتی ہری ہو جائے تو چلی جانا۔" ایک مسخ چہرے نے قہقہہ بلند کیا۔

"یہاں تک میں خود پہنچی ہوں۔ یا مجھے لایا گیا۔ یہ فیصلہ میں آج تک نہیں کر پائی۔" وہ ہسپتال کے دوسرے فلور کے پرائیوٹ وارڈ میں قد آدم کھڑکی سے باغیچے کا منظر دیکھ رہی تھی دوسری جانب راؤنڈ اباؤٹ سے گاڑیاں تیز رفتاری کے ساتھ شہر کے چار مختلف سمتوں میں مڑ رہی تھیں، پولیس چوکی کے قریب ہی ایک وین کھڑی تھی۔ اور ٹریفک کانسٹیبل ڈیوٹی پر حاضری کے لئے قطار درست کر رہے تھے۔

ڈاکٹر نے اسے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ صبح کے راؤنڈ پر جب وہ اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا تو مہرالنساء بیڈ پر تکیہ سے پیٹھ لگائے اخبار دیکھ رہی تھی۔ کسرتی جسم کا نوجوان ڈاکٹر اس کا معالج ہی نہیں راز دار بھی تھا۔ اس نے نرس کو باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اسے سمجھایا۔

تمہاری ہوسناکی تمہیں ٹھکانے لگا دے گی۔ اس بار تمہارا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں آپریشن خطرناک تھا۔ مگر اب شاید تمہارا جسم " تمہارے شوق اور آپریشن کی نزاکتیں برداشت نہ کرسکے "اس لئے تمہیں بڑی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔"

"مگر ڈاکٹر، ایسا کیوں۔ تم میری BIOLOGICAL NEED اور کیمیکلز سے اچھی طرح آگاہ ہو" اس کے لہجے میں تشویش کا پہلو نمایاں تھا۔

"وہ اس وجہ سے بے بی" کہ اس بار تمہارے نئے دوستوں نے کچھ نئے اور خطرناک قسم کے تجربات کر ڈالے تھے جس سے تمہارے جسم کے بعض حصے بری طرح مجروح ہوئے ہیں بروقت میڈیکل ایڈ نے تمہیں بچا تو لیا لیکن ایسا کوئی دوسرا "حادثہ" پیش آیا تو مجھے ڈر ہے کہ تمہارے کسی کام نہ آسکوں۔ بہر حال اب تمہیں اس کھیل سے چاہے خود پر خواہ کتنا ہی جبر کرنا پڑے ہاتھ اٹھا لینا چاہئے۔ میں تمہارے معالج اور دوست کی حیثیت سے یہی مشورہ دے سکتا ہوں۔ اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا تمہارا کام ہے۔"

"ہوں۔ تو یہ بات ہے۔ اس بار شاید مجھے مکمل طور پر اندھیرے میں رکھ کر "کھیل" کھیلا گیا۔"

"میرا خیال ہے شاہد شاید تمہارا نیا "نگران" ہے۔" ڈاکٹر ایک آنکھ دباتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"کم از کم اسے ضرور سوچنا چاہئے تھا۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔ میرے پروفیشن کا آدمی ہے 'حریص' خود غرض اور بے رحم' اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو مجھے اکسائٹ کرتی ہیں 'اس کے علاوہ کاروبار اور کھیل کے نشیب و فراز سے باخبر' اس کی دوستی سے میرے شوق "اور WITCH HUN TING دونوں کو بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ وہ پالتو کتے کی طرح میرے اشاروں کی زبان سمجھتا ہے۔ میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے اس جیسے کچھ لوگ شاید اسی کام کے لئے پیدا کئے جاتے ہیں"۔

"تم مجھ میں رقابت کی آگ بھڑکا رہی ہو۔" ڈاکٹر کا لہجہ غیر سنجیدہ اور غیر جذباتی تھا۔ "شاید یہ بات نہیں' تم دونوں میں ایک بات مشترک ہے آسودگی کی لذت لہو میں شامل ہو جاتی ہے ہر بار ایک ناقابل بیان نشاط انگیز تجربہ ہوتا ہے۔ دوسری جگہ تم مختلف ہو تمہاری رفاقت نے مجھے تجربات کی نئی نئی دنیاؤں سے ضرور ہمکنار کیا۔ مگر اس میں کسی اور کی شمولیت یا کاروباری پہلو کبھی شامل نہ رہا۔ تمہاری رفاقت میری زندگی کا ایک حساس اور قیمتی خزینہ سے کم نہیں۔ مگر شاہد ان معنی میں تم سے مختلف ہے کہ اس نے تجربات کے ساتھ میری بلند پروازی کے خواب کو عملی صورت دینے میں میرا بڑا ساتھ دیا۔ اکثر اوقات اپنی حریصانہ عادت سے مجبور ہو کر الگ سے مجھے اپنے مالی فائدے کے لئے بھی استعمال کیا۔ تازہ کھیل بھی شاید اس کی اسی نیت کا بدترین نمونہ ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ ایسے ستم ڈھاتا رہا۔ مگر اس کی دوسری خوبیوں کے سبب میں اس کی شرارتوں کو معاف کرتی آئی ہوں اور شاید اس بار بھی"۔

وہ گہری سوچ میں ڈوب چکی تھی۔

بلند پروازی کا خواب کون نہیں دیکھتا۔ آغاز بہار کی بعض محرومیوں نے اسے بھی ایسے حسین خوابوں کا اسیر بنا دیا تھا۔ جس میں اکثر کبھی تھوڑا اور کبھی کبھی بہت کچھ کھونا پڑتا ہے۔ لوئر مڈل کلاس کی خود غرض اور خود سر عورت 'مہرالنساء کے سانولے اور بھرے بھرے جسم کے نمایاں خطوط اور زاویوں میں فتوحات کے رسیا مردوں کے لئے دلکشی کا سامان موجود تھا۔ انداز تخاطب اور لہجہ کی بے باکی نے اسے ایک خاص قسم کی خواتین کے حلقہ کے ہراول دستے میں شامل کر دیا تھا جو مرد معاشرے کے شاونزم کے خلاف ایک "فری سوسائٹی" کے لئے سرگرم عمل تھیں ان کے فلسفہ میں سیاسی اور اخلاقی پہلو سے زیادہ مرد معاشرے کے ظلم و ستم کے خلاف غیظ و غضب کا عنصر نمایاں تھا۔ ان کا فلسفہ تھا جب قدرت کے نزدیک مرد اور عورت برابر ہیں۔ بستر پر دونوں برابر کے پارٹنر ہوں تو پھر باہر کی دنیا میں ادنیٰ اور اعلیٰ 'کمزور

اور برتر کا تصور کیوں برقرار رکھا جائے۔ کیا یہ پابند اور مرد معاشرے کا دہرا کردار اور ناانصافی نہیں۔ ایک آزاد اور منصفانہ معاشرے میں عورت اور مرد دونوں کو پسند اور انتخاب کے مواقع اور حقوق برابر ہیں۔

اس نے شہرت اور دولت کا جو خواب دیکھا تھا' اس کے حصول کے لئے وہ ہر چیز قربان کرنے پر کمربستہ تھی۔ اس نے خاص تکنیک کے ذریعے اپنے جسم کے خطوط کو PROVOCATIVE بنانے اور جملوں کی ادائیگی کے لئے ساحرانہ گر سیکھ لیا جو بوڑھے اور ٹھنڈے جسم میں بھی برقی لہر دوڑا دیتا۔ وہ بہت تھوڑے عرصے میں طبقہ خاص میں ہر دلعزیز عورت بن گئی مقبولیت اور دولت کے ساتھ اس کے جسم کی کشتی نے لذت کی ایک ایسی دنیا دریافت کی جہاں وہ خطرناک تجربات سے بھی گریز نہ کرتی کیونکہ وہ جس دنیا میں داخل ہوئی تھی اس میں تجربات کو فیشن میں UNDEFINE. EXCITMENT کا نام دیا جاتا۔

شاہد اس کی زندگی کا پانچواں ایسا دوست تھا جس کی ہنرمندی کی لذت منفرد اور نشاط انگیز تھی۔ وہ ایسا نشہ اور اشتہا تھا جس کی ضرورت اس نے ہمیشہ محسوس کی۔ وہ مہرالنساء کی اس کمزوری سے واقف ہو چکا تھا۔ اور اپنی اس خوبی کا معاوضہ وصول کرنے میں کوئی رعایت دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ اس معاملے میں مہرالنساء سے کم خود غرض اور بے رحم نہ تھا۔ وہ جب کوئی نیا شکار تلاش کرتا' اپنا معاوضہ ایک خود غرض اور تجربہ کار ایجنٹ کی طرح بلا تاخیر وصول کر لیتا۔ اس نے جب بھی مانگا مہرالنساء ایک سحرزدہ عورت کی طرح اسے ادا کرتی رہی۔

ڈاکٹر نے چلتے چلتے اسے راز داری سے خبردار کیا تھا کہ اس کے ORGANIC SYSTEM میں وہ SEXUAL APITISER کا کام دے رہا ہے۔

"تم اسے چھوڑنے کا ارادہ بھی کرو تو ایسا کرنا شاید تمہارے لئے ممکن نہ ہو، تمہارا اعصابی نظام جو پہلے ہی چٹخ چکا ہے۔ اس ڈوز کے استعمال کے بغیر ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ تمہارا عضوی نظام حرکت کے قابل بھی نہ ہو گا۔"

"تو گویا وہ میرے مالی معاملات کے علاوہ میری "عضوی ضرورت" کا حصہ بھی بن چکا ہے۔" اس کی زندگی کا یہ حیرت انگیز انکشاف تھا۔

"ٹھیک ہے کسی سے شادی کی آرزو تو اب خواب ہی بن چکا ہے۔ چلو ایسا ہی سہی"۔

ڈاکٹر مسکراتے ہوئے وارڈ سے باہر نکل گیا تھا۔ اس کے تجربات میں وہ بھی کبھی شامل رہا

تھا۔ مگر اب؟

مہرالنساء بہت آگے جا چکی تھی۔

"پھر کیا ارادہ ہے؟" شاہد نے مخصوص انداز میں سگریٹ کا کش کھینچتے ہوئے سوال کیا۔

"سوچ لو، کہیں ایسا نہ ہو کمان سے تیر نکلنے کے بعد نشانہ خطا ہو جائے، مجھے تو وہ خاصا چالاک گرگ دکھائی دیتا ہے۔ سر کے کھچڑی بال، عینک کے پیچھے تیزی سے حرکت کرتی ہوئی آنکھیں۔ اس کا دھیما اور سرد لہجہ، جسم کے اندر اترتا محسوس ہوتا ہے۔ اتنی آسانی سے وہ تمہارے تیار کئے ہوئے جال میں پھنسنے والا نہیں۔" اس نے شاہد کو خبردار کیا۔

"مرد چاہے کتنا چالاک اور عیار کیوں نہ ہو۔ عورت کے معاملے میں کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی مار ضرور کھاتا ہے۔ اب تم مجھی کو دیکھ لو۔" شاہد نے اپنی بات میں مزاح پیدا کرتے ہوئے گفتگو جاری رکھی۔

"وہ ایک مالدار آسامی ہے اسٹیٹس میں رہ چکا ہے، ٹھیک ٹھاک بینک بیلنس ہے میں اس کے یہاں سال بھر سے کام کر رہا ہوں اسے مغربی طرز کے FASHION AND FABRIC کے لئے ایسی طناز خاتون کی ضرورت ہے جو شہر کے مخصوص طبقہ کے فیشن زدہ خواتین اور شوقین مردوں میں خود کو آسانی سے فٹ کر لے۔ اور ہر ماہ نہیں تو کم از کم ہر دوسرے تیسرے ماہ اس کے میگزین کی ٹائیٹل اسٹوری فراہم کر دیا کرے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کے بارے میں کچھ ایسی اطلاعات بھی ہوں، جو...... سمجھ گئیں نا میری بات۔"

"آگے بڑھو۔" اس نے شاہد کی باتیں غور سے سنتے ہوئے سر ہلایا۔ وہ ایسے کئی "معرکے" پہلے بھی انجام دے چکی تھی۔

"باقی کام یہ ہے کہ اس دوران تم اس چھوٹے سے ایمپر ر کی ایسی ضرورت بن جاؤ جس کو وہ نظرانداز کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے اس کے قریب رہ کر اس کی بھی کمزوریاں تمہارے ہاتھ آئیں گی۔ بس یہی ہماری وہ منزل ہوگی، جس کا خواب تم ایک طویل مدت سے دیکھتی رہی ہو اور میں بھی۔ اس کی دولت ہمارے شاندار خواب کی تعبیر۔" اس کی انگلیوں کے درمیان پھنسا ہوا سگریٹ کا دھواں دائرے بناتا ہوا اس کے آبنوسی چہرے کو پراسرار بنا رہا تھا اس کی آواز خوابیدہ اور لہجے میں سفاکی تھی۔ اس نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"اس منصوبے کی کامیابی کا سارا انحصار اس بات پر ہے کہ تم کتنی عیاری سے اس کی دنیا

میں اپنی ضرورت کی آگ بھڑکاتی ہو، مجھے یقین ہے کہ تم یہ کام آسانی سے کرلوگی کیونکہ ایسے مردوں کے لئے تمہارے جسم کے خطوط میں ایک خاص قسم کی رغبت ہے جو آتش شوق کو بھڑکاتی ہے۔"

"تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔" اس نے شاہد کو غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"بعض مردوں میں بھی یہی خوبی ہوتی ہے۔ یعنی وہ خواتین کی "اشتہا" بڑھانے کا ہنر جانتے ہیں۔ تم میری اس "خاص خوبی" سے بخوبی آگاہ ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

اس نے شاہد کو کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ اسے گہری نگاہوں سے تولتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"باتیں بہت ہو چکیں آؤ اب چلیں۔"

"کہاں"؟ شاہد کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"مت شرارت کرو۔" مہرالنساء کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔

"منصوبہ تو طے پا چکا نا۔" شاہد نے سگریٹ کو جوتے سے مسلتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں بھئی، اور کیسے اقرار کروں۔ میں نے پہلے کبھی تمہاری بات کو ٹالا ہے جو اب ٹال دوں گی۔" اس کا حلق گرمئی شوق سے خشک ہو رہا تھا، دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے فلیٹ کے دوسرے کمرے میں داخل ہو گئے جو ان کی تنہائیوں اور WITCH HUNTING کا راز دار تھا۔

"پھر اس کہانی کا انجام؟" میرے دوست نے دلچسپی کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے سوال کیا

"اس ساحرانہ کھیل کا انجام دراصل وہ آغاز ہے، جو ابتدائی بیان میں آچکا ہے چونکہ میں بھی اس "کھیل" کا ایک خاموش تماشائی تھا۔ اس لئے اس ڈرامہ کے انجام سے باخبر رہا تھا۔"

"بادشاہ چھوٹا ہو یا بڑا، بادشاہ ہی ہوتا ہے۔ وہ تجربہ کار کھلاڑی ثابت ہوا۔ اس نے مہرالنساء کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جانے کا تاثر دیکر شاہد کو اس خواب سے بہت قریب کردیا۔ جو دونوں نے مل کر دیکھا تھا۔ مگر۔؟"

"مہرالنساء کی چیخیں گلشن اقبال کے سنسان فلیٹ کے در و دیوار توڑ کر باہر نہ نکل سکیں اس

کے اذیت ناک خواب میں ڈوبتے ہوئے ذہن دھندلائی ہوئی آنکھوں کے سامنے ایمپرر کے علاوہ اس کے تین مصاحبین کے مسخ چہرے بھی گردش کر رہے تھے۔ ابلتی ہوئی آنکھیں، موٹے اور بھدے ہونٹ اور نوکیلے دانت مہرالنساء کو جب احساس ہوا کہ FASHION AND FABRIC کا پبلشر اس کے کھیل سے باخبر ہو گیا ہے تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔

اس کا ذہن اذیتوں کے طوفان میں گھرا تاریکی میں ڈوب رہا تھا۔ سورج اس کے سر کے اوپر آگ برسا رہا تھا۔ اور وہ تپتے ہوئے ریگزار پر آبلہ پا دوڑ رہی تھی 'اس کے ہونٹوں پر طویل اور تھکا دینے والی صحرا کی پیاس کی تڑپ تھی۔

ڈاکٹر نے شاید اسے چلتے چلتے یہی مشورہ دیا تھا۔

اب تمہارا جسم کسی نئے تجربے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ سمجھ گئیں نا۔"

لیکن وہ وارڈ سے جاتے ہوئے اپنے معالج دوست کو یہ نہ بتا سکی کہ اس بار تجربے میں اس کی اپنی مرضی کا کوئی دخل نہ تھا۔ بلکہ۔؟

انتخاب

روزن

کرخت اور بیہودہ آوازوں میں گھری ایک چیخ تھی جس سے اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ بڑی مشکل سے نیند آئی تھی۔ کیونکہ ٹھیک میرے سر کے اوپر اور آنکھوں کے سامنے بڑا سا بلب جل رہا تھا جس کی تیز روشنی موندی ہوئی آنکھوں میں بھی انی کی طرح اترتی محسوس ہوتی اور آنکھوں سمیت جسم کا رواں رواں بے کلی کا شکار، جاگتا رہتا۔ سردی کی طویل اور سیاہ رات آنکھوں آنکھوں میں کٹ جاتی۔ اس رات، جانے کیسے نیند آگئی تھی۔

یک لخت جاگنے سے دل بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ میں کچھ دیر خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھا اپنی بے ترتیب اور بگڑی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس دوران باہر بھونڈی، بھدی اور برہنہ گالیوں کا شور جاری رہا میرے دائیں اور بائیں پہلو میں میرے دوست "واؤ" کی شکل میں سمٹے سکڑے سو رہے تھے۔ دو دنوں کے بعد نیند نے ان کو ہر چیز سے بے نیاز کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک دل کے کسی پیچیدہ مرض میں مبتلا تھا۔ اس کی جیب میں جو بچی کھچی گولیاں رہ گئی تھیں ان میں کچھ خواب آور نکیاں بھی شامل تھیں۔ شاید انہی گولیوں کا گہرا اثر تھا، ورنہ کیسے ممکن تھا کہ ملے جلے شور اور چیخ کے باوجود وہ سوتا رہتا۔

میں نے غیر ارادی طور پر کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی، مگر میری کلائی خالی تھی، مجھے یاد آیا۔ مجھے اس چھوٹی سی کوٹھری میں داخل کرنے سے پہلے میری گھڑی اتار کر مال خانہ میں جمع کر دی گئی تھی تاکہ مجھے اندر یہ نہ معلوم ہو سکے کہ دن یا رات کی کون سی گھڑی یا پہر ہے۔ یہ

اپنی جگہ خود ایک سنگین سزا ہے۔ ناقابل بیان اذیت' وقت کے درمیان رہتے ہوئے وقت کی پہچان نہ ہو سکے۔ رات اور دن ایک جیسے ہوں۔ گزرنے والے لمحہ اور آنے والے لمحہ میں کوئی فرق محسوس نہ ہو۔ یکساں' اجنبی اور بے رنگ و بو۔

ہماری کوٹھڑی کی دیوار بہت بلند تھی۔ پختہ اور سپاٹ۔ ایک کیل بھی نظر نہ آتی اور پھر چھت اور دیوار سے جڑے' دو تنگ روزن تھے جن میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی تھیں جن کے ذریعہ باہر کی کھلی اور آزاد فضاؤں سے اتنی مدہم اور دھندلی دھندلی روشنی آتی کہ وقت کا تعین کرنا مشکل تھا۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی خاص بناوٹ تھی تاکہ اندر کے لوگوں کو ڈھیر ساری روشنی حاصل نہ ہو۔ دوئم یہ کہ باہر ان کھڑکیوں کے قریب برگد کا ایک جٹادھاری پیڑ اس طرح سر نہوڑائے کھڑا تھا کہ اس کی بہت ساری بے ترتیب شاخیں جن پر بڑے بڑے میلے پتے لٹکے ہوئے تھے' کھڑکی پر جھک آئی تھیں۔ پُرامن برگد کے پیڑ کے اس عمل سے ہوا اور روشنی کا راستہ رک گیا تھا۔ ہم نے یہی سنا تھا کہ برگد نروان اور روشنی کی علامت ہے۔ مگر یہاں تو وہ کچھ اور ہی گل کھلا رہا تھا۔ اس طرح ہماری یہ کوٹھڑی اس اندھی آنکھ کی مانند تھی جہاں وقت ایک سیال دھبے میں منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ سارے رنگ بے رنگ۔ اور سارے موسم جھوٹ کے موسم تھے۔ یہاں قدرت اور متحرک زندگی سے ہر رشتہ کٹ کر رہ جاتا ہے۔

کوٹھڑی میں صرف تنہائی کا عذاب تھا۔۔ جو بعض اوقات اس قدر شدید اکتاہٹ طاری کرتا کہ یہی جی چاہتا کہ ان چپ چپ' اجنبی اور بے حس دیواروں سے سر پھوڑ لیا جائے۔

کئی روز گزر گئے' مگر چند مخصوص چہروں کے سوا باہر کا کوئی شناسا چہرہ نظر نہ آیا۔ اندر ہم جتنے تھے' ایک دوسرے کا چہرہ' پڑھ پڑھ کر تھک گئے یہاں تک کہ چہرے کے نقوش' خدوخال حتیٰ کہ ایک ایک لکیر تک یاد ہو گئی۔ باتیں ختم ہو گئیں۔ اکتا کر منہ لپیٹ کر جھوٹ موٹ آنکھیں بند کر لیتے۔ مگر آنکھیں بند کرتے ہی خوف اور اندیشوں کا لشکر اتنے زور سے حملہ آور ہوتا کہ آنکھوں کے پٹ آپ ہی آپ کھل جاتے اور سردی کے باوجود جسم پسینے میں بھیگ جاتا۔

کوٹھڑی کی دیواریں ہم سے لاتعلق خاموش رہتیں۔ مگر ان پر لکھی گئی ادھوری مٹی مٹی

تحریریں ' نقش و نگار اور آڑی ترچھی لکیریں زبان بن گئی تھیں ۔ یہاں آنے والے جانے سے پہلے کسی نہ کسی شکل میں اپنے جذبات اور احساسات چھوڑ گئے تھے ۔

"یہاں کے دو دن ' دو صدیوں کے برابر ہیں ۔"

"دنیا اعتبار کے قابل نہیں ' کسی پر بھروسہ نہ کر ۔"

"میں جا رہا ہوں ' پھر آؤں گا ۔ کیونکہ میرا کوئی دوسرا ٹھکانہ نہیں ۔"

"اس تنہائی میں تیری یاد ' میرا سب سے بڑا سہارا ہے ۔"

کہیں کہیں عورت کی تصویر بنی تھی ' کسی جگہ بڑی مہارت سے گملوں میں پھول سجائے گئے تھے اور کسی گوشے میں چھری اور چاقو لہرا رہے تھے ۔

میں دو دنوں تک دیواروں پر لکھی ہوئی تحریروں کو پڑھنے ' گملوں میں سجے ہوئے پھولوں ' عورتوں ' چھریوں اور تلواروں کی تصویریں دیکھنے میں مصروف رہا ۔ تیسرے دن یہ مشغلہ اپنے اختتام کو پہنچا اور میں تھک کر چھدری دری پر ایک جانب بیٹھ گیا ۔

"ایک بار پھر موہن جو داڑو کے کھنڈرات تیار ہو رہے ہیں ۔" میں نے گہرے دکھ کے ساتھ سوچا ۔

"انسانی تہذیب ' ہر جگہ ' ہر لمحہ اپنے دکھ سکھ ' اپنی خوشیوں اور المیوں کی تاریخ رقم کرنے میں مصروف ہے ۔"

کوٹھری کے دروازے پر موٹی موٹی آہنی سلاخیں ' اس طرح فٹ کی گئی تھیں کہ صرف تین انگلیاں باہر نکل سکتی تھیں ۔ چونکہ یہ کوٹھری بائیں جانب بنی ہوئی تھی ۔ اس لئے طویل راہداری سے آنے والی روشنی راستے ہی میں دم توڑ دیتی اور کوٹھری کے دروازے تک اندھیرے کے سائے ہی پھیلے رہتے ۔ یہاں بھی دن اور رات کا فرق مٹ گیا تھا ۔ بس جی کو ہولا دینے والی تاریکی اور جسم پر کپکپی طاری کرنے والی ٹھنڈک ہر وقت جمی رہتی ۔ لوہے کے دروازے پر بڑا وزنی تالا پڑا ہوا تھا اور باہر سنگین والی رائفل لئے ایک طویل القامت اور تنومند پہریدار ڈیوٹی تبدیل ہونے تک روبوٹ کی طرح چکر لگاتا رہتا ۔ اس کے بھاری بوٹوں کی کھٹ کھٹا کھٹ کی آواز سے اندر کی خاموشی زیادہ دل شکن محسوس ہوتی ۔ میں اکثر سلاخوں سے لگ کر راہداری میں روشنی تلاش کرنے کی کوشش کرتا مگر وہاں گونگے ' بہرے لہراتے

ہوئے سایوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ سائے، تاریکی اور خاموشی ہمارا مقدر بن کر رہ گئی تھی۔ بڑی اکتاہٹ اور جھنجھلاہٹ طاری رہتی۔ یا خدا، کہیں سے کسی روزن، کسی سوراخ سے روشنی کی ایک کرن۔ کوئی چہرہ، کوئی مسکراہٹ زندگی سے کوئی تو رابطہ۔

کوٹھری کے اندر ہی پاخانہ تھا، اتنا گندہ اور غلیظ کہ اس جانب دیکھنے ہی سے جی متلانے لگتا کھلے دروازے پر ٹاٹ کا چیتھڑا پردہ جھولتا رہتا، جس پر پان کی اتنی پچکاریاں ماری گئی تھیں کہ اس کا رنگ تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے اندر جانے کی ہمت اشد ضرورت ہی کے وقت ہوتی۔ شروع کے دو تین دن بہت بھاری گزرے۔ اس کے تعفن سے دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہوتا۔ مگر بتدریج ہم اس کی بدبو سے کسی حد تک مانوس ہو گئے۔

اس روز جب میں اندر گیا تو اچانک میری نگاہ اوپر اٹھ گئی۔ وہاں بھی بہت اونچائی پر ایک روزن تھا اور اس میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اور ان سلاخوں کے درمیان سے خوشنما رنگ برنگ پھولوں کی چند بیلیں اندر گھس آئی تھیں۔ ان کی سبز پتیاں ترو تازہ اور کومل تھیں۔ روزن سے آنے والی ہوا سے بیلیں ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔ مجھے ان بیلوں کو دیکھ کر خوشی کی جو لہر محسوس ہوئی وہ ناقابل بیان تھی۔ میں نے الٹے پیروں کمرے میں آکر اپنے دوستوں کو خوشخبری سنائی۔

"پھول اور سبز پتیاں۔"

"کہاں۔ کہاں دیکھ لیا۔"

"اندر۔" میں نے اشارے سے بتایا۔

"دونوں کے چہرے پر مسکراہٹیں اور آنکھوں میں چمک تھی۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"زندگی سے ہمارا رشتہ جڑ گیا۔"

(گرد آلود شام)

(۱۹۸۲)

☆

بندی گھر

وہ میرے دفتر کا پہلا دن تھا۔ حادثہ کچھ اتنا عجیب و غریب اور غیر متوقع تھا کہ میں کچھ دیر کے لئے ششدر رہ گیا' بات اتنی اہم اور سنگین بھی نہ تھی کہ میں پہلے کچھ سوچ لیتا اگر دفتری زندگی کا پہلے سے کچھ تجربہ ہوتا تو شاید بات یوں نہ بگڑتی کہ مجھے گھنٹوں منہ پھاڑے ٹک ٹک دیدم کی تصویر بن جانا پڑتا۔ اسٹیبلشمنٹ برانچ (ESTABLISHMENT BRANCH). سے پوسٹنگ آرڈر حاصل کرنے مین خاصی دیر ہوگئی تھی 'چونکہ مجھے اسی روز اپنی برانچ میں پہنچ کر رپورٹ کرنی تھی اس لئے وہاں سے سیدھے میکلوڈ روڈ روانہ ہوگیا' جہاں میرا نیا دفتر تھا میکلوڈ روڈ کے ایک چوراہے پر بائیں جانب ایک تنگ سی گلی تھی۔ گلی کا نام شاید کراچی کے کسی مرحوم تاجر یا صنعت کار کے نام تھا کوچہ حاجی امیر علی سوڈا واٹر والا مرحوم زندگی میں یقیناً ایک کامیاب تاجر رہے ہوں گے 'کیونکہ مرنے سے قبل انہوں نے گلی کی تعمیر اور گلی کے اندر ایک وقف شدہ عمارت پر لاکھ دو لاکھ کے اخراجات برداشت کر کے اللہ میاں سے بھی سودے بازی کی کوشش کر ڈالی تھی۔ پتا نہیں وہ اپنی کوششوں میں کس حد تک کامیاب ہوئے تھے البتہ مدتوں کے بعد بھی گلی کے نکڑ پر پیتل کے ایک زنگ آلود ٹکڑے پر "کوچہ حاجی امیر علی سوڈا واٹر والا" کا نام ابھی تک زندہ تھا۔

پوری گلی ویران پڑی تھی 'نیم تاریکی اور گہری خاموش میں لپٹی ہوئی پاگل چہرے کی مانند سپاٹ بے مصرف اور بے معنی تھی۔ گلی کے اندر ہلکا سا دھواں اڑ رہا تھا۔ اندر کو گلی جہاں ختم ہوئی تھی کوڑے کا ایک بڑا سا ٹین رکھا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف ردی کاغذ۔ روئی

کے باسی ٹکڑے جانوروں کی ہڈیاں سگریٹ اور ماچس کی خالی ڈبیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کوڑے کے ڈھیر پر ایک خارش زدہ کتا دیر سے پنجے مار مار کر پوری گلی کو گرد آلود کئے ہوئے تھا۔ گلی کے نکڑ پر ایک بڑے میاں ریڑھی پر حلوہ پوری بیچ رہے تھے۔ دیوار کے ساتھ ایک بوسیدہ بنچ پڑی تھی جس پر دو تین آدمی بیٹھے ہوئے بڑے بڑے انہماک اور رغبت سے حلوہ پوری کھا رہے تھے ان کے چہرے اور انکی آنکھوں میں صدیوں کی بھوک کی اذیت ناک پرچھائیاں تھیں وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر پوری کے بڑے بڑے نوالے حلق سے یوں نیچے اتارنے میں مصروف تھے کہ کہیں کوئی ان کے ہاتھوں کا نوالہ چھین نہ لے 'ٹوک نہ دے 'کھانے سے منع نہ کر دے 'ان میں سے ایک آدمی کھانے سے فارغ ہو کر اٹھا جلدی جلدی اپنی انگلیاں چاٹیں 'چپڑ چپڑ کر کے دو تین بار چٹخارے لئے اور پتلون کی جیب سے ٹٹول ٹٹول کر پیسے نکالے اور بڑے میاں کی ہتھیلی پر رکھ دیئے پھر دو تین بار مڑ مڑ کر حلوہ پوری کو لالچی نظروں سے دیکھتا ہوا میرے قریب سے گذر گیا وہ شاید اسی دفتر کا ملازم تھا جہاں مجھے جانا تھا 'کیونکہ وہ اسی عمارت میں داخل ہوا تھا مجھے یہ سب کچھ بے حد عجیب بے ڈھنگا اور سخت اکتا دینے والا لگ رہا تھا۔ یہاں کی پوری فضا میں ایک خاص قسم کی بیچارگی اور کینہ پن رچا ہوا تھا۔

میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ آؤٹ ڈور گیمز کا دلدادہ 'سیر سپاٹے کا رسیا اور لاپرواہی کی ایسی زندگی جس میں کوئی ذمہ داری کا بوجھ اور اقتصادی الجھن نہ تھی مگر والد کے اچانک انتقال سے پورے کنبے کی ذمہ داری ایک دم مجھ پر آن پڑی تھی اور مجھے یونیورسٹی کی کھلی فضا اور آزاد دنیا کو اچانک خیرباد کہہ کر روزگار کا سہارا لینا پڑا تھا۔ رونق منزل کی تیسری منزل پر میرا دفتر تھا رونق منزل نام کو رونق منزل تھی۔ پوری عمارت ایک ایسے ماتمی چہرے کی مانند تھی جسے دکھ سہتے زمانہ بیت گیا تھا جگہ جگہ بے رونقی اور اجاڑپنے کی کیفیت جھانک رہی تھی۔ میں نے اندازہ کیا کہ گلی میں ایک جانب دبکی ہوئی اس عمارت پر شاید کارپوریشن والوں کی نظریں نہیں پڑیں ورنہ اس عمارت کو مخدوش قرار دے کر ڈھا دینے میں کارپوریشن کا عملہ ہرگز تکلف یا مروت سے کام نہ لیتا رونق منزل کے سامنے حاجی امیر علی سوڈا واٹر والا کی وقف شدہ بوسیدہ فلیٹوں کی چھوٹی چھوٹی بے ڈھنگی سیڑھیاں نیم تاریکی میں پرانے زخم کے سیاہ کھرنڈ کی مانند بدرنگ اور غلیظ دکھائی دے رہی تھیں۔ فلیٹوں کو ایک نظر دیکھنے کے بعد ہی پتا چل

جاتا تھا کہ اس میں کچھ کاٹھیاواڑ اور بمبئی کے معمولی تاجر پیشہ میمن آباد ہیں۔ حیرت اس بات پر تھی کہ فلیٹ کے نیچے گلی میں اس آبادی کے باوجود غنودگی اور خاموشی پھیلی ہوئی تھی، جبکہ میمنوں، کھمیوں کاٹھیاواڑی بچوں کو شروع ہی سے اسٹاک ایکسچینج اور سٹہ بازار میں ہلا گلا مچانے کی معقول تربیت دے دی جاتی ہے۔ فلیٹ کی بالکونیوں پر لکڑی کی آڑی ترچھی جھریاں بنی تھیں، جن میں کبھی کبھی کسی تعلتملی اور ناک شڑشڑاتی عورت کی جھلک نظر آجاتی تھی۔ کہیں کہیں الگنی پر ریشمی شلواریں، سرخ رنگ کے دوپٹے بچوں کے نیکر اور مردوں کے میل سے چکٹ بنیائن سوکھنے کے لئے لٹکے ہوئے تھے۔

رونق منزل کی سیڑھیوں پر بھی نیم شبی کا اندھیرا تھا۔ میں دیوار کا سہارا لے کر اوپر چڑھا۔ پہلی منزل پر تین بڑے بڑے کمرے تھے۔ جن کی چھت لکڑی کی تھی۔ جگہ جگہ سے ہارڈبورڈ ادھڑ کر نیچے جھول گئے تھے۔ دیواروں کا پلاسٹر ٹوٹ ٹوٹ کر فرش پر بکھرا ہوا تھا اور تاریک سنسان کمروں میں موٹے موٹے چوہے اطمینان سے ایک دوسرے کی رگیدا رگیدی میں مصروف تھے۔ پرانی فائلوں کے بڑے بڑے بنڈلوں پر چوہوں نے خوب دانت تیز کئے تھے۔ کٹے پھٹے کاغذ "فلیپ" اور "فائل کوور" آدھے سے زیادہ کمروں میں بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے، دوسری منزل پر سیڑھیوں کے قریب ہی ایک بڑی سی سیاہی مائل میز کے عقب میں مجھے ایک فربہ جسم کا آدمی بیٹھا ہوا ملا۔ اسکی آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک تھی، عینک کے فریم پر میل جم رہا تھا اور کمانی کی جگہ اس نے موٹے موٹے دھاگے باندھ کر کانوں پر لپیٹ لئے تھے۔ وہ پہلے کئی لمحوں تک مجھے تولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا

"کہو بھائی کیا بات ہے۔؟"

میں نے اپنا پوسٹنگ آرڈر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے اپنی عینک درست کی اور بڑے غور سے پڑھنے کے بعد مجھ سے بولا۔

"پھر اسی بات پر چائے منگوالو۔"

میں نے کہا "چاچا دفتر تو جوائن کرلوں، چائے بھی پی لینا۔"

"میاں تم یہاں آتو رہے ہو، مگر ایک بات کا خیال رکھنا، مجھ سے اڑی نہ کرنا، چائے والے کا خیال رکھنا، ورنہ ہر روز حاضری رجسٹر کے ساتھ "بڑے دربار" میں تمہاری پیشی

ہوتی رہے گی... تیسری منزل پر تیسرے کمرے میں چلے جاؤ' لیکن اس وقت کم از کم ایک آدھ سگریٹ ہی پلادو' بڑی دیر سے طلب لگ رہی ہے۔"

تیسری منزل پر پہلی اور دوسری منزل سے کہیں زیادہ اندھیرا تھا پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے وہ شخص رونق منزل کی تاریکی کا ایک حصہ معلوم ہوا' بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا اسکی آنکھوں میں حریصانہ چمک اور ہونٹوں پر گہرے طنز کی مسکراہٹ تھی' پہلے کمرے میں دو اکاؤنٹس افسر (ACCOUNTS OFFICERS) ٹیبل لیمپ کی روشنی میں زرد سائے کی طرح لرز رہے تھے' ان کی لمبی چوڑی میزوں پر فائلوں کے انبار تھے پشت کی جانب لکڑی کے شلف میں بھی مٹیالے رنگ کے فائل تلے اوپر رکھے تھے انکے سوکھے ساکھے چہروں پر زردی کھنڈ رہی تھی۔ وہ بڑے انہماک سے فائل دیکھنے میں مصروف تھے' دروازے پر خاکستری رنگ کا ایک دبیز پردہ لٹک رہا تھا' کبھی کبھی پردہ ہٹتا تو اندر کا منظر ایک لمحہ کیلئے آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔ دوسرے کمرے میں بھی مجھے بے شمار فائلوں اور کاغذات کے موٹے موٹے بنڈلوں' گتوں کے درمیان چار پانچ آدمی کام کرتے ہوئے نظر آئے' مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ وہ قد کاٹھ چہرے مہرے اور تاثرات کے اعتبار سے ایک ہی جیسے تھے' دبلا پتلا جسم' ہانپتی کانپتی آواز موٹی موٹی عینک اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں' بڑھے ہوئے بال گھسے پٹے ریکارڈ کی سی آواز' بلغمی کھانسی' بار بار چائے کی طلب اور سستے سگریٹوں کے لمبے لمبے کش...."یار' آج تو کٹ جاؤ۔ منگوالو دو پیالی چائے' فوکس اون میرے ذمہ" دوسرے کمرے کی یہ آوازیں حریص بھی تھیں اور ملتجی بھی۔

میں اب اپنی برانچ کے سامنے کھڑا تھا۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ نیم وا دروازے کی جھری سے اندر کا منظر خاصہ حوصلہ شکن تھا۔ اندر اندھیرا تھا۔ دروازے کے قریب ہی ایک بڑی سی میز کا نصف حصہ نظر آرہا تھا جس پر ایک ہٹلر نما ہاتھ کی پتلی پتلی' بے رنگ بدوضع انگلیاں بے چینی سے میز پر ٹھوکے دے رہی تھیں' کمرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ لمبی لمبی میزیں لگی تھیں' ان میزوں پر فائلوں کے بے شمار بنڈل ایک کے اوپر ایک رکھے تھے۔ نوٹ شیٹس اور ڈرافٹ پیپر جگہ جگہ سے باہر جھانک رہے تھے۔ فائلوں کے انبار سے ایک شخص کا سر ابھرا۔ اس نے میز پر قلم رکھا دو چار جمائیاں لیں اور ایک لمبی انگڑائی کے بعد میز کے اوپر سے فائلوں

کا ایک بنڈل کھینچا' اور زور سے اپنی میز پر پٹک دیا، فائلوں سے اڑتی ہوئی گرد کی چادر میں وہ چھپ گیا۔ گرد کی ہلکی ہلکی چادر میں اس کا چہرہ اور بھی زرد اور بیمار نظر آنے لگا تھا' وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ پھر تھک کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اس کا سر جو مجھے باہر سے نظر آرہا تھا۔ فائلوں میں گم ہو گیا۔

"اف توبہ ہے' یہ گرد تو جان لے کر رہے گی۔" اس جملہ میں اس کی آواز کئی بار ٹوٹی تھی۔

میں نے دروازے پر کھڑے کھڑے پیچھے مڑ کر دیکھا' آئیڈیل زندگی کو آنکھ مار کر کہا۔

"جان من رخصت ہو جاؤ اب تو بقیہ زندگی آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ پر گزرے گی۔ خواہ مخواہ میرے ساتھ رہ کر تمہیں پشیمانی ہوگی۔ بس اب تم لوٹ جاؤ۔ اس دروازے تک ہمارا تمہارا ساتھ تھا' اس دروازے کے اندر ہمارا میل ملاپ کسی کو ایک آنکھ بھی نہ بھائے گا۔"

میں نے دروازے پر ہاتھ رکھا تو دروازے کا ادھ کھلا پٹ تیز چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا شاید دروازے کی تیز چرچراہٹ اندر بیٹھنے والوں کو بہت ناگوار گزری تھی۔ میں انکے چہروں پر ناگواری کے اثرات صاف طور پر دیکھ رہا تھا۔ ان کے سارے بے معنی اور سپاٹ چہروں پر ایک ہی سوال تھا جو ایک نئے سوالیہ چہرے سے جواب طلب کر رہا تھا۔ کمرہ کشادہ نہ تھا۔ اس کی شکل چوکور تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ لمبی میزیں تھیں اور ہر قدم کے فاصلے پر ایک کرسی پر ایک کلرک بیٹھا ہوا تھا' افسر انچارج کی میز دروازے کے ساتھ ہی تھی۔ اس کی عمر چالیس پینتالیس کے درمیان ہوگی' لیکن دیکھنے میں وہ ساٹھ ستر سال کا پھوس بڈھا معلوم ہوتا تھا۔ جس نے شاید اپنی زندگی کے بہترین لمحات اسی قبر میں گذار دیئے تھے۔ ہم اپنی اپنی قبروں کے خود ہی مجاور ہیں' ہاں آج پرانی قبروں کے درمیان ایک نئی قبر کا اضافہ ہونے والا ہے۔ ایک نیا مجاور آیا ہے جو تمام عمر اپنی قبر کے سرہانے بیٹھ کر سینہ کوبی کرے گا۔ تم لوگ اسے خوش آمدید کہو' مگر تمہارے چہروں پر یہ کیسی خاموشی ہے کیسی بے معنی سوچ منجمد ہو کر رہ گئی ہے۔ کیا تمہیں میرے آنے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی کیا تم لوگوں کو اس بات کا احساس نہیں کہ آج تمہاری خاموش آبادی میں ایک نئے شخص کا اضافہ ہوا ہے جس کی سانسوں میں ابھی تک باہر کی فضاؤں کی تازگی خوشگوار ہوا کی خوشبو رچی ہے' جو اپنے سینے میں زندہ رہنے کا حوصلہ اور اپنی آنکھوں میں سورج کی کرنوں کی چمک سمیٹ لایا ہے کہ اس نیم تاریک' نیم

خاموش فضا میں زندگی کی لہر دوڑا سکے ' لیکن یہ کیا ' تمہارے چہروں پر جھنجلاہٹ کیسی ' آنکھوں میں کدورت اور کینہ توزی کیوں تمہارے ہونٹوں پر یہ طنز ' یہ مسکراہٹ کیوں تمہارے چہرے پر یہ بے معنی سوال کیوں؟"

کمرے میں کل آٹھ افراد تھے ' چھ تو ادھیڑ عمر کے تھے ' دو نوجوان ہونے کے باوجود کھچڑی بال اور موٹی موٹی عینکوں کی وجہ سے ادھیڑ عمر کے لگ رہے تھے ' دبلا پتلا بیمار زدہ جسم ' موٹی موٹی عینک ' فائلوں کے انبار ' کھوکھلی کھانسیاں ' بلغمی تھوک سگریٹ کا دھواں ' اس ماحول کی قدر مشترک تھی ' میں نے اپنا پوسٹنگ آرڈر (POSTING ORDER) افسر انچارج کو بڑھا دیا' اس نے پہلے اپنی عینک کو اتار کر قمیض کے دامن سے صاف کیا اور پھر پوسٹنگ آرڈر کی تحریر غور سے پڑھنے کے بعد بولا:

"پہلی سروس ہے یا اس سے پہلے بھی کر چکے ہو؟" اس کی آواز سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اختلاج قلب کا پرانا مریض ہے۔

"جی ہاں۔ یہ میری پہلی نوکری ہے۔"

"خیر۔ خیر ' جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا ۔ اس بات کا خیال رہے کہ یہ یونیورسٹی یا پلے گراؤنڈ نہیں ہے۔ یہاں تم اسپورٹس اسپرٹ سے داد وصول کر سکو۔ یہ سرکاری دفتر ہے اور دفتر کے کچھ اصول اور قوانین ہوتے ہیں۔ جنکی پابندی ہر حال میں تم پر لازم ہوگی۔ وقت پر آؤ۔ اپنی میز کا پورا کام ختم کر ڈالو ' جانے کا ارادہ تم پر چھوڑ دیا جائے گا ' لیٹ بیٹھ کر کام کرنا (EFFICIENCY) میں شمار کیا جاتا ہے ' ترقی اور سالانہ انکریمنٹ کا انحصار ان ہی باتوں پر ہوتا ہے سمجھ گئے نا۔"

بات کرتے کرتے اس کا چہرہ یکبارگی سرخ ہو گیا۔ جسم کا بچا کھچا خون سمٹ کر اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں کے حلقے اور بیٹھے ہوئے رخساروں کو گرما گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شاید ایک معمولی لمحہ کے لئے ترحم کے جذبات آئے تھے ' لیکن پھر وہی کرختگی اور سفلہ پن جھانکنے لگا جو برسوں کی کڑی ریاضت میں اسے حاصل ہوا تھا۔ میں سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ اپنے صحت مند جسم کے ساتھ باہر کی جو تازہ ہوا ۔ پھولوں کی خوشبو اور سورج کی روشنی سمیٹ کر لایا تھا۔ انہیں اندر لانے کی سختی سے ممانعت کر دی گئی تھی۔

"میری باتوں کو سمجھ گئے" اس کی آواز میں تحکم اور گھڑکی تھی۔

میں جو کچھ دیر کے لئے گم ہو گیا تھا۔ ہڑبڑا کر بولا "جی ہاں' جی ہاں بالکل۔"

میری سعادت مندی اور یس مین والے جواب سے شاید اسے بڑی تسکین حاصل ہوئی تھی۔ اس نے فخر سے ایک بار پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ آنکھوں' آنکھوں میں اپنے ماتحتوں سے کہا میرے رعب کا عالم دیکھا اور پھر اپنے چشمہ کو دامن سے صاف کرتے ہوئے کڑکڑایا

"جاؤ وہ تیسری میز تمہاری ہے' کام سنبھال لو۔"

میں نے محسوس کیا کہ دفتر کے دوسرے ساتھیوں نے مجھے ذہنی طور پر قبول نہیں کیا۔ میرا صحت مند جسم' چہرے اور آنکھوں کی تازگی' بازوؤں کی مچھلیاں رفتار کی شوخی اور بے باکی ہمارے اور انکے درمیان حائل تھی....:

جب میں اپنی میز پر پہنچا تو عقب سے ایک مدھم سی گھسی پٹی آواز آئی۔

"لونڈہار پن ٹیک رہا ہے ایک ہفتے میں سارا کس بل نکل جائے گا"۔

میز کی بائیں جانب ایک لمبی سی کھڑکی تھی۔ جو تقریباً چار پانچ ہاتھ اوپر تھی۔ اس کے دونوں پٹ بند تھے' کمرے میں سخت گھٹن اور بوسیدہ فائلوں کی مکروہ بدبو پھیلی تھی' درمیان میں صرف ایک پنکھا تھا' جو گھر... گھر... گھوں.... گھوں کی آواز کے ساتھ بڑی دھیمی اور بیمار رفتار سے چل رہا تھا۔

پتا نہیں یہ اس کھڑکی کو کیوں نہیں کھولتے۔ اگر کھڑکی کھل جاتی تو شاید اندر اس قدر اندھیرا اور گھٹن نہ ہوتی۔ میرا خیال ہے آج یہ لوگ کھولنا بھول گئے ہیں۔ میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے بابو پر نظر ڈالی وہ ابھی نوجوان تھا۔ مگر چہرے کی بیشمار جھریاں اور کھچڑی بال اور آنکھوں کی میلی میلی رنگت سے وہ کہیں زیادہ عمر کا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بال گھنگھریالے تھے' ناخونوں میں سیاہ میل جما ہوا تھا اور وہ بار بار ڈرافٹ پیپر پر قلم سے آڑی ترچھی لکیریں کاٹ رہا تھا۔

مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے بولا "تمہاری شادی ہو چکی ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابھی نہیں اور مستقبل قریب میں بھی کوئی امکان نظر نہیں آتا۔"

"میں تمہارے اس جملے سے محظوظ نہیں ہوا' میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عورت انسان کی پہلی اور آخری ضرورت ہے اور تم اس دفتر میں رہ کر ہمیشہ اس سے محروم رہو گے۔"
پھر اس نے تیزی سے ڈرافٹ پیپر پر ایک ننگی عورت کی تصویر بنا کر مجھے دکھائی۔ "کیسی ہے؟"
"اچھی ہے۔" میں نے بشاشت سے جواب دیا۔
"رکھ لو' تمہارے کام آئے گی" اتنا کہہ کر وہ مجھ سے لاتعلق ہو گیا اور کسی فائل پر نوٹ لکھنے میں مصروف ہو گیا یہ بات چیت اس سے زیادہ نہ بڑھ سکی' میں اس سے مایوس ہو کر دوبارہ کھڑکی کے متعلق سوچنے لگا۔ میرے لئے ممکن نہ تھا کہ میں اس تاریک گھٹن میں سانس لیتا۔ میں نے اپنی کرسی پر کھڑے ہو کر کھڑکی کے ایک پٹ کو زور لگا کر کھول دیا' تازہ ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ ہی سورج کی روشنی نے اندر کی گہری تاریکی کو جگمگا دیا لیکن اس کے ساتھ ہی کمرے کے اندر گھٹی گھٹی چیخیں بلند ہوئیں' میں نے پلٹ کر دیکھا تو آفس انچارج سمیت تمام کلرک آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چیخ رہے تھے۔ کھڑکی بند کرو خبیث۔ کیا ہماری آنکھیں پھوڑو گے۔"
میں نے ترنت کھڑکی بند کر دی۔ کھڑکی بند ہوئی تو کچھ دیر کے لئے پہلے سے زیادہ تاریکی کمرے پر مسلط ہو چکی تھے آنکھیں تاریکی سے مانوس ہوئیں تو ایک دم سے سبھی مجھ پر برس پڑے۔
"تمہیں کیا ضرورت تھی کھڑکی کھولنے کی' دیکھتے نہیں روشنی میں آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔ اگر تمہیں تازہ ہوا اور روشنی کی اتنی ضرورت ہے تو یہاں آنے سے پہلے اور نکلنے کے بعد جتنا جی چاہے حاصل کر لیا کرو' لیکن آئندہ سے کمرے کی یہ کھڑکی نہ کھولنا۔"
میرے پاس والے ساتھی نے میز سے پیپر ویٹ اٹھا لیا تھا۔ "اگر اب کی بار یہ حرکت کی تو سر پھاڑ دوں گا۔ آئندہ احتیاط رکھنا۔"
تیسرے بابو نے کھانس کر کہا۔ "میاں ہمیں روشنی نہیں چاہیے۔ ہمیں اس کمرے میں تازہ ہوا نہیں چاہیے روشنی میں آنکھیں چمکنے لگتی ہیں اور تازہ ہوا سے سانس پھولنے لگتی ہے ہم تو اس تاریک کمرے کے عادی ہیں تم ہمیں اس حال میں رہنے دو' گڑبڑ کی تو نقصان اٹھاؤ گے۔ کیا سمجھے۔"

"جی ہاں۔ جی ہاں' بالکل سمجھ گیا کہ تازہ ہوا اور سورج کی روشنی آپ کی آنکھوں اور پھیپھڑوں کے لئے مضر ہیں' میں آئندہ سے اس بات کا پورا پورا خیال رکھوں گا۔"

میں بڑی دیر تک حیرت کی تصویر بنا ٹک ٹک دیدم' دفتر کا تاریک کمرہ' بوسیدہ فائلوں کے انبار گرد اور تھکن کا لحاف اوڑھے ہوئے پھیکے بے جان اور سپاٹ چہروں پر زندگی کی علامات تلاش کرتا رہا' مگر کمرہ بے حد تاریک تھا اور تاریکی میں کسی چیز کو ڈھونڈ لینا آسان کام نہیں ہوتا۔ میں نے بند کھڑکی کی جانب دیکھا' جھری سے باہر ہلکی ہلکی حیات بخش دھوپ کی حرارت اور روشنی اندر گھسنے کا راستہ ٹٹول رہی تھی۔

روشنی کی چمک اور دھوپ کی حرارت اور چڑیوں کا شور' اف باہر کی زندگی کس قدر حسین اور صحت مند ہے۔ میں ایک بھرپور انگڑائی لے کر کرسی پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

(سوا نیزے کا سورج)

۱۹۷۰ء

سوا نیزے کا سورج

موت ان کے تعاقب میں تھی اور وہ مسلسل بھاگ رہے تھے' وہ اپنے پیچھے اپنے ساتھیوں عزیزوں کی لاشیں چھوڑ آئے تھے' موت تباہی اور کھنڈرات' ان کا گاؤں ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ آسمان پر چیلیں منڈلا رہی تھیں اور کتے شکستہ مکانوں کے پاس ڈراؤنی آواز میں انسانوں کی لائی ہوئی تباہی کا اعلان کر رہے تھے۔

اس چھوٹے سے قافلے میں پانچ افراد تھے' ان میں ایک عورت بھی شامل تھی۔ عورت کا جسم ایک میلی سی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کی زردی' مائل چھاتی ننگی تھی' ایک چھوٹا سا بچہ اس کی خشک چھاتی سے چمٹا چسڑ چسڑ دودھ چوسنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر اس ڈری ڈری' سہمی سہمی ماں کی چھاتی میں دودھ کہاں تھا جو اس کی بھوک مٹاتا۔ بچے کی بڑی بڑی آنکھوں میں موت کا خوف نہیں تھا' بھوک کی شدت تھی' وہ رہ رہ کر کر چلانے لگتا .اور ماں گھبرا کر اسے اپنی چھاتی میں دبا لیتی' بچہ جب بھی روتا' چاروں مرد اسے وحشت زدہ نظروں سے دیکھنے لگتے۔

"چپ کراؤ ۔۔ چپ کراؤ ۔۔ فوجی پکڑ لیں گے' ہمیں مار دیں گے" ۔۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بھی تھا وہ بار بار لنگی ہٹا کر اپنی سوکھی ران کھجانے لگتا۔ اس کے پاؤں کے تلوے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور ان پر خون رس رس کر جم گیا تھا۔ وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھ کر بڑبڑاتا۔ "الٰہی کس آزمائش میں ڈال دیا۔"

اس قافلے میں ایک نوجوان آدمی بھی تھا۔ اس نے خاکی بشرٹ اور پتلون پہن رکھی تھی

آستینیں پھٹ گئی تھیں۔ پتلون کے نچلے حصے کی دھجیاں اڑ رہی تھیں۔ گھنی جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس کے جسم بازوؤں اور چہرے پر خراشیں لگ گئی تھیں۔ وہ اضطراری حالت میں بار بار ان خراشوں کو کھجانے لگتا جن پر خون کی بوندیں خشک ہو کر جم گئی تھیں۔۔ سیاہی مائل کھرنڈ اس کا پاؤں سوج کر کُپّا ہو گیا تھا۔ دس بارہ قدم دوڑنے کے بعد وہ لنگڑانے لگتا۔ تیسرے اور چوتھے آدمی کی حالت بہت غیر تھی۔ وہ لنگی باندھے ہوئے تھے' ان کی بنیان سے پسینے اور میل کی بدبو اٹھ رہی تھی۔ ان کی دھنسی ہوئی آنکھیں موت کے خوف سے مزید دھنس گئی تھی۔ ان کے گال پچکے ہوئے تھے۔ پیٹ کی بھوک اور موت کے خوف نے انہیں زندہ در گور کر دیا تھا۔

وہ عورت جس کے جسم سے ایک میلی چادر لپٹی تھی شاید بنگالی تھی۔؟

نہیں۔ وہ بہاری تھی۔

وہ صرف ایک عورت تھی۔

اس کی سوکھی چھاتی سے چمٹا ہوا بچہ ' صرف ایک بچہ تھا اس کا تعلق کسی رنگ اور نسل سے نہیں تھا. .وہ صرف ایک معصوم بچہ تھا اور اس کی زندگی اس کی ماں کی طرح قیمتی تھی۔

اس عورت کے علاوہ چاروں افراد بنگالی تھے۔ نہیں وہ بہاری تھے۔

ٹھہریئے نہ وہ بنگالی تھے نہ بہاری وہ صرف انسان تھے۔ ان کا تعلق کسی ایک جگہ سے نہ تھا ' پوری دھرتی ان کا گھر تھا۔ وہ چار روز سے مسلسل بھاگ رہے تھے جنگل ' میدان ' کھیت ' ندی ' نالے پیچھے رہ گئے ' فاصلے سمٹتے گئے فاصلے بڑھتے گئے۔ خوف نے ان کے مردہ اور چور چور جسم میں زندہ رہنے کی خواہش بیدار کر دی تھی۔ وہ کسی جگہ تھوڑی دیر کے لئے رکتے تو مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ انہیں دوبارہ بھاگنے پر مجبور کر دیتی۔ عورت نڈھال ہو گئی تھی۔ اس کے ہر قدم پر سو سو قیامتیں گزر گئیں۔ پھر بھی وہ چل رہی تھی۔ بھاگ رہی تھی' اسے اپنی جان سے زیادہ اپنے بچے کی زندگی عزیز تھی۔ اس نے راستے میں کئی جگہ چھوٹے چھوٹے بچوں کی لاشیں دیکھی تھیں۔ وہ لرز گئی۔ کانپ "کانپ گئی اور اپنے بچے کو زور سے اپنی چھاتی سے بھینچ لیتی۔ رات کو تھوڑی دیر کے لئے آنکھ لگتی تو کوئی اسے جھنجھوڑ کر جگا دیتا۔ "فوجی آرہے ہیں۔ قریب سے گولی چلنے کی آواز آئی تھی۔ "اٹھو۔۔ جلدی جلدی چلو"۔۔ پھر وہ

درماندہ قافلہ کے ساتھ گھسٹنے لگتی۔

ایک ٹرک ان کا مسلسل تعاقب کر رہا تھا۔ ٹرک پر درجن بھر فوجی بیٹھے تھے' ان کے جسم پر وردی تھی' ہاتھوں میں رائفلیں مشین گنیں' ان کے چہرے ایک جیسے تھے خاموش گم سم۔ شاید یہ باوردی رضا کار تھے۔۔ جو "صفائی کی مہم" کے دوران زمین کے بیٹوں سے زمین کو پاک کرنے کی مہم میں مصروف تھے۔

پانچ افراد پر مشتمل چھوٹا سا قافلہ ایک جگہ جھاڑیوں اور جلے ہوئے کیلے کے پیڑوں کی آڑ میں بیٹھ کر سستانے لگا۔ بارود کے دھوئیں میں لپٹی ہوئی رات کی وحشت ناک تاریکی دھیرے دھیرے زمین پر اتر رہی تھی' ہر چیز پر دھندلاہٹ طاری تھی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ موت اچانک ان کے سروں پر پہنچ جائے گی۔ ٹرک کی آواز کہیں قریب سے سنائی دی' وہ سب کے سب موت کی دہشت اور خوف سے کھڑے ہو گئے۔ فرار ہونے کا راستہ بند ہو چکا تھا۔ موت موت بے بسی کی موت' انہوں نے انتہائی مظلومیت سے ایک دوسرے کو دیکھا' آخری دیدار۔ ان کے ذہن میں زندگی کی موہوم سی امید ابھی باقی تھی۔ اگر ٹرک انہیں دیکھے بغیر گزر جائے تو شاید وہ بچ جائیں۔۔ ہاں' ایسا ممکن ہے۔ ممکن ہے۔۔:

"دیکھو ٹرک قریب آگیا"

"خاموش۔ خاموش رہو"

ٹرک بالکل قریب پہنچ گیا' ٹرک پر بہت سارے رضا کار بیٹھے ہوئے تھے' وہ اپنا فرض پورا کرنا چاہتے تھے اور بالکل خاموش تھے۔

جھاڑیوں کی آڑ میں پانچ افراد دم سادھے خاموش تھے' وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے وقت کا ہر لمحہ قیمتی تھا۔ وہ اس طرح خاموش تھے جیسے انہوں نے زندگی بھر ایک لفظ ادا نہ کیا ہو' ٹرک قریب سے گزر رہا تھا۔ اس کے شور سے درختوں کی شاخوں میں چھپے ہوئے پرندے شور مچاتے ہوئے اڑنے لگے تھے' اچانک اور غیر متوقع طور پر عورت کا بچہ کلبلانے لگا' اس نے ماں کی چھاتیوں سے منہ ہٹا لیا قریب ہی کھڑے ہوئے نوجوان آدمی نے گھبرا کر عورت کو دیکھا پھر سب نے پریشان ہو کر عورت کو دیکھا۔ بوڑھے آدمی نے پھسپھسا کر کہا۔۔ "بچے کی چیخ ہماری زندگی کا آخری لمحہ ہوگی۔"

"ہاں ۔۔۔ ہاں ہم سب مارے جائیں گے"

"شی شی ۔۔ چپ چپ ......!" عورت نے گھبرا کر اپنا ہاتھ اپنے بچے کے منہ پر رکھ دیا، ٹرک لمحہ بھر کو اس جگہ رک گیا۔ دو تین افراد اترے اور جھاڑیوں کے قریب پیشاب کرنے لگے۔ جب وہ دوبارہ ٹرک پر چڑھ گئے تو ٹرک آگے بڑھ گیا۔۔ مگر وہ نصف گھنٹے تک اسی جگہ چھپے رہے۔ خطرے کا احساس ختم ہونے کے بعد وہ اپنی جگہ سے باہر نکلے۔

وہ عورت رو رہی تھی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس کی چھاتی سے چمٹا ہوا بچہ اس کے ہاتھوں کے دباؤ سے گھٹ کر مر گیا تھا۔

(سوا نیزے کا سورج)

۱۹۷۱ء

بصارت

"بہت دیر ہو گئی۔"

"ہاں جی! بہت دیر ہو گئی۔"

نابینا نے ہاتھ ملتے ہوئے دوسرے نابینا کو جواب دیا اس نے اپنی ایک آنکھ پر ہرے رنگ کی پٹی باندھ رکھی ہے دوسری آنکھ بھی بصارت سے محروم ہے دونوں شاید نروس کے بھی مریض ہیں ویسے بھی اس کمرے میں داخل ہونے کے بعد ہر مریض نروس کا شکار ہو جاتا ہے۔

یہاں آنے والے ہر نابینا کے علم میں یہ بات پہلے سے ہوتی ہے کہ یہ اس کا آخری ٹھکانہ ہے۔ اگر یہاں بھی اسے بینائی کی نعمت نہ ملی تو وہ زندگی بھر اندھیرے کے گہرے کنویں میں ڈبکیاں لگاتا رہے گا روشنی کی کوئی کرن اس کی آنکھوں کے تاریک دریچوں کو پھر کبھی روشن نہ کر سکے گی۔ ساری زندگی بصارت سے محروم، معذور اور بے بس رہے گا دوسروں کے رحم و کرم پر۔

انتظار گاہ سے متصل دوسرے کمرے میں جہاں روشنی کی نعمت بٹتی ہے اس کے کاؤنٹر پر جو داروغہ (کلرک) بیٹھا ہے شاید وہ بھی نابینا ہے بڑی عجیب بات لگتی ہے! اس روشن کدے کا داروغہ بھی بصارت سے محروم ہے! اس کی آنکھوں پر موٹے فریم کی بھاری سیاہ عینک ہے باہر سے پتا نہیں چلتا کہ سیاہ شیشے کے پیچھے اس کی آنکھوں کے اندر گھومنے والے ڈھیلے دیکھ سکتے ہیں یا بصارت سے بالکل محروم ہیں تاہم یہ بصارت گاہ کی تجلی ہے کہ وہ بینا لوگوں کی طرح اپنے اعصاب اور اعضا کو حرکت دے رہا ہے اس کے سامنے کاغذ کا ایک پیڈ ہے اس کی انگلیوں

کے درمیان پھنسا پیانو بال پن کاغذ پر تیزی سے رواں ہے وہ وقفے وقفے سے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بصارت پانے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے سائلوں کو اس طرح گن رہا ہے جیسے وہ ان کو دیکھ ہی نہیں سکتا بلکہ ان کے چہروں کے تاثرات بھی بخوبی پڑھ سکتا ہے۔ یہ شاید "مسیحا" کے اس کمرے کا معجزہ ہی ہے کہ نابینا' بینا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ "رضوان" اپنے میلے رومال سے جو اس کے پیڈ کے قریب ہی پڑا ہے' بار بار آنکھوں سے بہنے والے پانی کو پونچھتا ہے اس عمل کے دوران اس کی سیاہ عینک ذرا اوپر کو اٹھ جاتی ہے مگر پھر بھی یہ پتا نہیں چلتا کہ اس کے دیدوں کے چراغ روشن ہیں یا بجھ چکے ہیں میرے مشاہدے میں یہ دقت اس وجہ سے بھی محسوس ہو رہی ہے کہ میں خود بھی بصارت گنوانے کی آخری منزل پر ہوں۔

اس کمرے کے باہر دروازے پر جہاں بینائی اور بصارت کی نعمت تقسیم ہوتی ہے' پیتل کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر بہت خوش خط یہ جملہ درج ہے "اللہ نے تمہیں جن نعمتوں سے نوازا ہے ان میں بصارت سب سے بڑی نعمت ہے۔"

یہاں ہم سب اس وقت بصارت ہی حاصل کرنے کے لئے جمع ہیں لوگ بہت دور دور سے چل کر یہاں آئے ہیں' بستیوں اور شہروں میں جہاں بصارت کی جدید علاج گاہیں تعمیر ہو چکی ہیں یہ بات شہرت پا چکی ہے کہ بصارت کی واپسی صرف اور صرف اس جگہ ممکن ہے یہاں آنے والے مایوس نہیں جاتے بلکہ بینائی لے کر جاتے ہیں۔ ان کی تاریک دنیا میں دوبارہ روشنی کی بہار لوٹ آتی ہے۔ بات کچھ اسی طرح مشہور ہے۔

"دروازہ کب کھلے گا۔؟"

"ہاں بھئی' ہماری قسمت کا دروازہ کب کھلے گا؟"

"آج تو بڑی دیر کر دی سائیں نے۔"

ایک آواز بہت ساری آوازوں میں شامل ہو کر برسات کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو گئی اس بھنبھناہٹ میں حیرت اور حسرت کا جذبہ نمایاں ہے۔

"ہم بہت دور سے چل کر آئے ہیں۔ اللہ جانے ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے!" اس نے ایک بڑے دھاری دار رومال سے جو اس کے کندھے پر پڑا ہے' اپنی پیشانی' ناک کی پھنگی اور گردن پر بہتے ہوئے پسینے کو صاف کیا اور گول گول بے نور دیدے گھماتے ہوئے دوبارہ بڑبڑایا۔"

"روشنی مل جائے تو پھر سے کاروبار چل پڑے اس کے بغیر تو سب ٹھپ پڑا ہے۔"
"ہاں جی' اللہ جس پر عذاب نازل کرتا ہے اس سے بصارت کی نعمت چھین لیتا ہے۔ پتا نہیں ہم سے کون سا گناہ سرزد ہوا' کیا خطا کی ہم نے کہ ہماری بینائی چھن گئی۔"
کمرے میں ایک بار پھر مکھیوں کی بھنبھناہٹ تیز ہو گئی سارے نابینا اپنی سیٹوں پر بے چینی سے پہلو بدل رہے ہیں۔ ان کے ہونٹوں اور بے نور آنکھوں میں بس ایک ہی سوال ہے۔
"دروازہ کب کھلے گا؟ روشنی کب تقسیم ہوگی؟"
کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا "داروغہ" ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اس کی عینک کے موٹے اور سیاہ شیشے مزید سیاہ ہو گئے غصے سے اس کا لبوترا اور گوشت سے بھرا بھرا چہرہ بھی سیاہ پڑ گیا اس کی بھدّی اور موٹی ناک کے اوپر سیاہ مسّا بھی مزید سیاہ ہو گیا اور اس کا سارا جسم غصہ اور نفرت سے تھر تھر کانپنے لگا۔
"آخر انہیں گویائی کہاں سے مل گئی؟ آج تک تو ایسا نہیں ہوا۔ خاموشی سے بیٹھ کر انتظار کرنے والے پہلو بدلنے لگے۔ سوال کرنے لگے۔ دروازہ کب کھلے گا۔" وہ میز پر مکّا مارتے ہوئے دہاڑا۔
"چپ کرو' خاموش رہو اگر تمہیں بینائی واپس لینی ہے تو اپنے اپنے ہونٹوں کو سی لو۔ ورنہ دھکے مار کر نکال دوں گا۔"
داروغہ کی گرج دار آواز سے سب کی سٹّی گم ہو گئی سبھی خاموش ہو گئے جیسے کسی چلتی گاڑی میں اچانک بریک لگا دی جائے۔
"چپ ہو جاؤ بھائی چپ ہو جاؤ ورنہ یہ ظالم ہمیں بے فیض ہی بھگا دے گا۔ یہ لوگ منہ چڑھے ہوتے ہیں ان کی بات تو اندر والا بھی نہیں ٹالے گا۔"
"ہاں بھئی چپ ہو جاؤ، کسی طرح آج دروازہ تو کھلے"
کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی سارے اندھوں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے منہ بند کر لیا اور گردن جھکالی۔
"اگر ہم خاموش نہیں ہونگے تو دروازہ نہیں کھلے گا اور دروازہ نہیں کھلے گا تو ہمیں بصارت نہیں ملے گی ہم دنیا کو پھر سے نہیں دیکھ سکیں گے۔" نوجوان نابینا نے داروغہ کی جانب

گردن گھما کر فر فر اپنا سبق دہرایا اور پھر خاموشی سے سر جھکالیا بوڑھے، جوان، بچے سبھی ایک جیسی کیفیت سے دوچار ہیں۔

"اندھے کو بھلا کون پوچھتا ہے سائیں سگے بھی ٹھکرا دیتے ہیں۔"

داروغہ اطاعت کا یہ منظر دیکھ کر فاتحانہ مسکرایا اسے یقین نہیں تھا کہ لوگ اتنے دبّو اور بزدل ہو چکے ہیں معمولی گھُڑکی سے صابن کا جھاگ بن جائیں گے۔ اس نے اپنے سیاہ ہونٹوں پر سیاہ مسکراہٹوں کا جال پھیلاتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں مشورہ دیا۔

"خاموشی سے بیٹھے رہو، اندر سے جب حکم ہوگا، بصارت کی نعمت مل جائے گی۔"

"اچھا جی، ہم تو یہی سن کر یہاں آئے ہیں۔ بصارت ملنی ہوگی تو اسی در سے مل جائے گی ورنہ نہیں بس دل میں یہی آسرا لے کر آئے ہیں آگے اللہ کی مرضی۔"

"ٹھیک امید لے کر آئے ہو تم لوگ انتظار کرو اور صبر سے کام لو بے صبری اور جلد بازی میں کام بگڑ جاتا ہے سمجھے نا۔"

"جی جی، بالکل سمجھ گئے اب ہم اپنی زبان نہیں کھولیں گے۔"

۱۲X۱۲ کا کمرہ، اس وقت بالکل خاموش ہے گہرا سناٹا ہے آدم زاد کیا کوڑے تک کی آواز نہیں ہے ہم سارے نابینا جو مکمل یا نامکمل طور پر بصارت سے محروم ہیں آنکھوں کے چراغ روشن کرنے کی آرزو میں اس مقام تک پہنچے ہیں اور اس وقت اس کمرے کے رحم و کرم پر ہیں جس کے اندر ایک بے حد وجیہہ شخص نے جس کی پیشانی دمکتی ہے اور ہتھیلیوں سے روشنی کی کرنیں پھوٹتی ہیں، ہمیں باری باری بصارت دینے کا مژدہ سنایا ہے ہم نے اس کو دیکھا نہیں ہے لیکن اس کے بارے میں یہی کچھ سنا ہے لوگ کہتے ہیں کہ اس کی زبان اور ہاتھ میں جادو ہے وہ جس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیر دیتا ہے۔ اس کی بینائی لوٹ آتی ہے اور وہ دوبارہ ہر چیز کو دیکھنے لگتا ہے وہ علاج کا ایک پیسہ نہیں لیتا، صرف کہتا ہے "میری اطاعت کرو تم دوبارہ سب کچھ دیکھ سکو گے روشنی، تازگی اور شگفتگی کو اپنی آنکھوں کے پپوٹوں پر محسوس کر سکو گے تم یہاں سے ناکام اور نامراد نہیں جاؤ گے تمہاری آنکھوں کی خالی جھولی کو میں بینائی کے خزانے سے بھر دوں گا بس میری اطاعت کرو۔"

ہاں اس نے ہم سب سے، جو اس وقت انتظار گاہ میں اس کے کمرے کا دروازہ کھلنے کے

انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں یہی کہا تھا اور وہ اپنے وال ٹو وال کارپٹ 'ایئر کنڈیشنڈ کمرے کی کمپیوٹرائزڈ مشینوں کے درمیان (اس کو یہ سب کچھ جدید عہد کے تقاضوں کے مطابق عطا ہوا ہے) بے حد مصروف ہوگا۔ اس کی باتوں میں بڑی شفقت اور مٹھاس ہے اس کے کندھوں پر سنہرے بالوں کی گھنی زلفیں ہیں اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور سرمگیں ہیں۔ اس کی ناک ستواں 'کان کی نرم لویں' سرخ اور گردن صراحی دار ہے اس کے جسم پر سفید جبہ (ایپرن) ہے۔

کمرے میں بالکل خاموشی ہے گہرا سکوت 'وقت کا تسلسل اور دباؤ صرف اس وقت ٹوٹتا ہے جب کوئی نابینا خیالوں کی یلغار سے گھبرا کر پہلو بدلتا ہے یا بے خیالی میں اپنا ہاتھ کسی کی ران یا کندھے پر رکھ دیتا ہے پھر وہی خاموشی چھا جاتی ہے روح کو کھرچنے والی خاموشی۔ بوکھلاہٹ اور اکتاہٹ طاری کرنے والی خاموشی داروغہ کی ڈانٹ سے جو سوال بار بار ان کے ہونٹوں پر آرہا تھا اب ان کے اندر گردش کر رہا ہے ان کے سر جھکے ہیں مگر سوال بار بار سر اٹھا رہا ہے کمرے میں موجود سارے کے سارے نابینا یک بارگی 'مسلسل سوچنے کے عمل سے گزر رہے ہیں۔

کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا " رضوان " بصارتوں سے محروم لوگوں سے کچھ زیادہ مطمئن اور خوش نہیں ہے اس کا تجربہ تو یہی بتاتا ہے کہ جب لوگوں سے ان کی اصل چیز چھین لی جائے تو ان کے پاؤں کے نیچے جہنم کی بھٹیاں سلگنے لگتی ہیں اور سینوں میں آگ کے طوفان اٹھنے لگتے ہیں ان کی مجبوری 'محدود مدت تک تو ان کی زبان پر تالا ڈال سکتی ہے مگر پاؤں کے نیچے سلگتی بھٹی اور سینوں میں پلنے والا طوفان کسی نہ کسی دن ان کی چیخوں کے لئے راستہ بنا دیتا ہے۔

اس نے اپنی سیاہ عینک کے پیچھے سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بیٹھے ہوئے بینائی سے محروم مریضوں کو کینہ توز نگاہوں سے دیکھا ان کے اعصاب پر دباؤ بڑھ رہا ہے پہلے جو اپنی ہتھیلیوں کے پسینے بار بار پونچھ رہے تھے اب ان کی مٹھیاں بندھ گئی ہیں۔ مٹھیاں بھینچ لینے سے ہاتھ کے اوپر کی رگیں اور نسیں معدوم ہو گئی ہیں۔ داروغہ کو ہر معاملے کی بڑی پہچان ہے وہ جانتا ہے کہ پتیلی میں پانی کو کتنی دیر گرم کرنا چاہئے پریشر پوائنٹ کب پہنچتا ہے اور ککر کو چولہے سے کس وقت ہٹا لینا چاہئے؟ ابھی وہ اندازہ لگانے ہی میں مصروف تھا کہ ایک نوجوان

نابینا بے چینی کے عالم میں اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اس کا سراوپر کی کھلی ہوئی کھڑکی کے پٹ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا' مگر اس نے معمولی چوٹ کی پروانہ کی چیخ کر کہا۔

"دروازہ کب کھلے گا؟ کھلے گا بھی یا نہیں؟ ہمیں کب سے دلاسہ دیا جارہا ہے اگر ہماری بینائی لوٹا سکتے ہو تو بتاؤ' ورنہ جواب دو دروازہ کھولو' ورنہ ہم دروازہ توڑ دیں گے۔"

نوجوان نابینا کی باتیں سن کر داروغہ گھبرا گیا۔ آج تو یہ لوگ سچ مچ بغاوت پر اتر آئے ہیں حالانکہ یہ کئی سالوں سے آرہے ہیں مگر ان کے لہجے میں بغاوت آج تک پیدا نہیں ہوئی آخر آج انہیں کیا ہو گیا۔؟

اس نے غصہ' نفرت انتقام اور حقارت کے سارے جذبوں کو ایک گرجدار آواز میں سمیٹ کر کہا۔

"خاموش ہو جاؤ۔ ورنہ روشنی کی نعمت کبھی تقسیم نہیں ہوگی۔"

"پروا نہیں' پہلے ہمیں جواب دو' دروازہ کب کھلے گا تم ہم سے بار بار وعدے کرتے ہو اور اپنے وعدوں سے پھر جاتے ہو تم آج اور ابھی بتاؤ کہ دروازہ کب کھلے گا' ہمیں کب دیکھا جائے گا' ہمارا فیصلہ کب ہو گا؟"

بصارت سے محروم لوگوں میں بڑھتے ہوئے غم اور غصے کو دیکھ کر داروغہ نروس ہو گیا۔ اب تک تو یہی ہوتا آیا تھا کہ اس کی ایک ڈانٹ پر لوگ خاموشی سے بیٹھ گئے یا چلے گئے مگر آج جانے انہیں کیا ہو گیا؟ ایک دم سے سرکشی پر اتر آئے ہیں۔

"اچھا:" اس نے پاؤں پٹکتے ہوئے کہا" اندر جا کر معلوم کرتا ہوں مگر مجھے یقین ہے کہ آج بھی تم لوگوں کو بے مراد جانا پڑے گا بینائی بصارت کے لئے ترستے رہو گے۔"

بدرو' بدزبان داروغہ کے جانے کے بعد ایک بار پھر کمرے میں یک لخت سناٹا چھا گیا بینائی سے محروم لوگوں کا خیال تھا کہ داروغہ اتنی جلدی ہتھیار نہیں ڈالے گا اچھا خاصا فساد برپا کرے گا مگر توقع کے خلاف وہ بڑی آہستگی کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا جو ساؤنڈ پروف ہے باہر لوگ طرح طرح کے وسوسے اور خوف میں گھر گئے چھوٹے چھوٹے مجبور اور بے بس لوگوں کے پاس خوف زدہ ہونے کے سوا ہوتا ہی کیا ہے سو داروغہ کے جانے کے بعد اس خوف میں مبتلا ہو گئے کہ وہ جیسے آئے ہیں ویسے ہی واپس چلے جائیں گے بینائی

واپس نہیں ملے گی۔

"میرا کیا ہو گا"؟ آخر مجھے کس جرم کی اتنی بڑی اور کڑی سزا ملی میں دنیا کے ذرے ذرے کا حسن دیکھنا چاہتا ہوں۔شبنم کے اس پہلے قطرے کو دیکھنا چاہتا ہوں جو گلاب کے نازک پتوں پر گرنے کے بعد ہولے ہولے بڑی نزاکت سے جذب ہو تا ہے۔میں اس نومولود کو دیکھنا چاہتا ہوں جو ماں کے بطن سے پیدا ہو کر پہلے پہل گود کے تحفظ میں پہنچتا ہے۔گود سے بڑا تحفظ پھر کبھی نہیں 'کہیں نہیں ملتا' ان آنکھوں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو پہلی بار کھلتی ہیں اور روشنی کا ادراک کرتی ہیں وہی روشنی جس کی تخلیق کے بعد خالق نے سرگوشی کی۔

"روشنی اچھی ہے 'بہت اچھی"۔

میں سب کچھ دیکھنا اور محسوس کرنا چاہتا ہوں مگر اس سے قبل کہ میں زندگی سے زندگی کا رس حاصل کروں مجھ سے میری بصارت چھین لی گئی میری بینائی کی دنیا لوٹ لی گئی اور اب میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں جو دور دراز سے چل کر یہاں پہنچتے ہیں۔

"کیا واقعی ہماری کھوئی ہوئی بصارت واپس مل جائے گی۔؟"

یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب صرف ایک شخص دے سکتا ہے وہ شخص جس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہیں جو اپنے کمرے سے کبھی باہر نہیں نکلتا لوگ اس کو ٹھیک طور سے دیکھ بھی نہیں پاتے ایک تو وہ بینائی سے محروم ہوتے ہیں اور اگر تھوڑی بہت بینائی ہوتی بھی ہے تو وہ "مسیحا" سر سے پیر تک سفید ایپرن میں ملبوس ہو تا ہے شہر شہر' قریہ قریہ یہ بات مشہور ہے کہ اس کی باتوں میں شہد اور ہاتھوں میں جادو ہے اور بینائی واپس آجاتی ہے۔

کمرے کے سارے نابینا بے چینی سے پہلو بدل رہے ہیں۔کوئی اپنے ہاتھوں کا پسینہ پونچھ رہا ہے اور کوئی بے خیالی میں اپنی سیٹ کے فوم کو بار بار مسل رہا ہے۔ غربی دیوار پر جو اونچی کھڑکی ہے اس کی سلاخوں کے درمیان سے ڈوبتے سورج کی چند کرنیں سامنے کی دیوار پر اتر آئی ہیں مگر بے سود تاریکی پھر بھی دور نہیں ہوئی۔

"ہاں جی' دروازہ اب بھی نہیں کھلا' پتا نہیں کیا لکھا ہے ہماری قسمت میں۔"

ابھی ادھیڑ عمر کے اسکالر کا یہ جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ اچانک وہ دروازہ کھل گیا جس

کے کھلنے کے انتظار میں لامحدود وقتوں اور نامعلوم سمتوں سے چل کر لوگ یہاں پہنچے ہیں۔

"دروازہ کھل گیا۔"

کمرے میں بہت ساری آوازوں کا شور ہے اس شور میں خوشی بھی ہے اور خوف کا عنصر بھی غالب ہے۔

"دروازہ دوبارہ بند ہو گیا تو پھر کیا ہو گا؟"

دروازے سے سنہری زلفوں، ستواں ناک اور صراحی دار گردن والا مسیحا نمودار نہیں ہوا وہ کہیں نمودار نہیں ہوتا اس کے پی اے یا سیکریٹری ہی ظاہر ہوتے ہیں ایسے لوگوں کو نائب بھی کہا جاتا ہے یہاں بھی وہی داروغہ یا نائب نمودار ہوا اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ہے اس کی آنکھوں سے وہی حریصانہ پانی بہہ رہا ہے جس کو وہ بار بار اپنے میلے رومال سے صاف کرتا جاتا ہے۔

"میری بات غور سے سنو ایک بار کہوں گا۔ دہراؤں گا نہیں اندر صاحب کی طبیعت ناساز ہے کسی مریض سے نہیں ملیں گے۔ اسکے علاوہ ہمارے پاس اس سال کیلئے بصارت اور بینائی کا جو کوٹہ تھا وہ بھی ختم ہو گیا اب تم لوگ اگلے سال آؤ اور ہاں اگلے سال آنے کے لئے آج سے بلکہ ابھی سے اندراج کرانا ہو گا جو لوگ اندراج نہیں کرائیں گے ان کو اگلے سال بھی بینائی نہیں ملے گی لہٰذا جس کو بصارت اور بینائی کی ضرورت ہے کاؤنٹر کے قریب لائن لگا کر کھڑا ہو جائے۔"

کمرے میں پہلے تو مکھیوں کی بھنبھناہٹ احتجاج اور چیخ و پکار میں تبدیل ہو گئی۔

"یہ تو سراسر فراڈ ہے ہمارے ساتھ دھوکا۔"

"پچھلے سال کہا گیا کہ اگلے سال آؤ اس سال پھر کہا جا رہا ہے کہ اگلے سال آؤ یہ کھیل تو بڑی دیر سے کھیلا جا رہا ہے۔"

"آخر کب تک یہ کھیل جاری رہے گا؟ ہم کب تک بصارت اور بینائی سے محروم رہیں گے۔؟"

"اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے" داروغہ نے اپنے ہونٹوں کو نفرت اور حقارت سے سکیڑتے ہوئے کہا۔

"اس کا جواب وہاں ہے۔" اس نے کمرے کے اندر اشارہ کرتے ہوئے کہا اور وہ باہر نہیں آئیں گے وہ اکٹھے بہت سارے اندھوں سے ملنا پسند نہیں کرتے۔"

"لیکن ہم تو اس شخص سے ملنا چاہتے ہیں جس نے ہم سے بصارت واپس کرنے کا وعدہ کیا ہے۔"

اس ایک آواز میں بہت ساری آوازوں کا دکھ شامل ہے۔

داروغہ نے دوبارہ نفرت کا زہر اگلتے ہوئے جواب دیا۔

"انھوں نے کہہ دیا کہ وہ تم لوگوں سے ملنا نہیں چاہتے۔ زیادہ شور نہ مچاؤ اور یہاں سے چلتے بنو۔"

یہ کہہ کر داروغہ پلٹا اور کمرے میں داخل ہوگیا جہاں سے سارے نابیناؤں اور بصارت سے محروم لوگوں کو بینائی اور بصارت کی نعمت دینے کا وعدہ کیا گیا تھا کمرے کو اندر سے بولٹ کر دیا گیا۔

کچھ لوگ واپس جا رہے ہیں اور کچھ سر جھکائے کاؤنٹر کے قریب لائن بنا رہے ہیں۔

(ٹھہرا ہوا سورج)
۱۹۸۵ء

☆

مٹی

جب پہلی بار نئی بستی کی تعمیر کی بھنک ہمارے کانوں میں پڑی تو سید تراب علی نے بڑے کرب کے عالم میں اس خبر کو سنا اور تمام مصلحتوں سے بے نیاز ہو کر کہ ان کے ریمارک پر کون کیا سوچے گا اور کیا کہے گا اپنی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں تشویش اور تفکر کے بھنور پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ہوں 'تو پھر وہی کھیل 'نئی بستی 'نیا سفر 'اللہ تیری زمین میں آخر قافلۂ انسانیت کب تک مسافرت کے عالم میں رہے گا۔ کہیں تو منزل 'کسی جگہ تو مستقل پڑاؤ۔"

پھر ہوا یوں کہ نئی بستی کی تعمیر مکمل ہوئی اور جب کوارٹروں کا الاٹ منٹ شروع ہوا تو چھریرے بدن کے نازک اندام 'نازک خیالی کے شاہکار تراب علی 'چیف سٹلمنٹ کمشنر کے دفتر کے ایک گوشہ میں ٹین کے سائبان کے نیچے کھڑے سیاست اور سیاستدانوں کو کوس رہے تھے۔ "یہ سب انہی کا کیا دھرا ہے ورنہ ہم گھر سے بے گھر کیوں ہوتے۔"

میرا ذاتی خیال ہے کہ کوارٹروں کے الاٹمنٹ کی کاروائی اور اس کے حصول میں وہ ہرگز حصہ نہ لیتے اگر انکے پاس اس کا کوئی متبادل راستہ ہوتا۔ سر چھپانے 'موسم کے مصائب 'سردی گرمی اور برسات سے محفوظ رہنے کیلئے انسان کو اپنے سر پر چھت اور ارد گرد کچی یا پکی دیواریں تو چاہئیں۔ انسان کی یہ خواہش بھی کتنی عجیب ہے۔ اس کے اور گھر کے پہلے تصور کے درمیان یہ ازلی اور ابدی رشتہ آج بھی بعض تبدیلیوں کے ساتھ برقرار ہے۔ گھر کے بارے میں تراب علی کا اپنا فلسفہ تھا۔

"گھر دراصل 'انسان کے جسم کی طرح ہوتا ہے۔ اس میں خون کی روانی ہوتی ہے۔ لہو دوڑتا ہے۔ احساسات موجزن رہتے ہیں اور نرم ونازک دل 'بالکل انسان کے دل کی طرح پھڑکتا رہتا ہے اور انسان کے پاؤں کی طرح اسکے پاؤں بھی زمین کی مٹی میں پیوست ہوتے ہیں ۔ رشتہ اور رابطہ ہوتا ہے خالی خولی مکان نہیں ہوتا۔"

سید تراب علی کچھ سنکی 'نرتے اور فلسفی تھے۔ میں ان سے کچھ زیادہ بحث ومباحثہ نہیں کرتا نہ ہی دھیان دیتا وہ میری اس عادت کو پسند کرتے بقول ان کے "ہر آدمی نہیں سوچتا' بلکہ اکثریت نہیں سوچتی 'سوچنا ہر آدمی کا کام بھی نہیں اگر ہر آدمی سوچنا شروع کردے تو کام کون کرے گا لیبر کہاں سے آئے گی ؟" بہر حال وہ بڑی مجبوری اور بے بسی کے عالم میں میرے پاس ہی کھڑے ایک بسی بسائی بستی سے بید خلی کا نوٹس وصول کرکے ایک دوسری نو تعمیر بستی کے کوارٹر کے الاٹ منٹ کے انتظار کے کرب سے گزر رہے تھے۔ ذہنی اور روحانی اذیت کے سارے آثار ان کے چہرے پر عیاں تھے انہوں نے مجھ سے کہا۔

"تمہیں کچھ پتا ہے اس پروسس میں آدمی پر کیا گذرتی ہے جسم وجاں پر کیا قیامت ٹوٹتی ہے لحہ لحہ قتل ہونا پڑتا ہے حکومتوں کا کیا'سیاستدانوں کا کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک تو سیاست میں ہر چیز جائز ہے اقتدار پر ہر شئے قربان کی جاسکتی ہے ہم یہاں برسوں سے آباد ہیں یہاں ہماری مسجدیں ہیں' قبرستان ہے' گھر ہے مٹی ہے' اسکی باس ہے انسان کی پہچان زمین ہی سے تو ہوتی ہے کبھی تم نے محسوس کیا کہ یہاں کی مٹی میں کتنی خوشبو ہے سوندھی سوندھی نشہ آور یہ خوشبو بھلا کہیں اور ملے گی تمہیں۔ بولتے کیوں نہیں چپ کیوں ہو"؟

میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا "ممکن ہے نئی کالونی اس سے اچھی ہو آپ کو زیادہ پسند آئے دیکھ تو لیں۔"

اتنا کہنا تھا کہ ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے تیوریاں چڑھ گئیں بڑی بڑی روشن آنکھوں میں چمنی کا کالا کالا دھواں بھر گیا۔

"بالکل ٹھیک میاں تم کو یہی کہنا تھا نئے زمانے کے ہونہار ترقی کی تبدیلی میں اگر تمہیں اپنے خون اور رشتہ کو توڑنا پڑے تو تم وہ بھی کر گزرو گے۔تم لوگوں سے کوئی بعید نہیں اصل میں تمہارے پاؤں نے زمین کی مٹی کا پیغام تمہارے دل تک پہنچایا ہی نہیں تم بھلا میری بات کیا

سمجھو گے۔"

اتنا کہنے کے بعد تراب علی شدید بدمزگی کے عالم میں مجھ سے منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے یہ انکی ناراضگی کا واضح اظہار ہوتا۔

بدمزاج کلرک سٹلمنٹ کمشنر کی موجودگی میں جو ایک اونچی، نقشین اور آرام وہ کرسی پر براجمان تھے باری باری نام پکار کر الاٹمنٹ کے کاغذات حوالے کر رہا تھا لوگ الاٹمنٹ وصول کرنے کے بعد کمشنر صاحب بہادر کیجانب ذرا جھک کر اظہار تشکر کرتے اور فاتحانہ قدموں سے واپس ہوتے جیسے زندگی کا سب سے بڑا معرکہ سر ہو گیا۔

مکان انسان کی کتنی بڑی ضرورت ہے اس کا احساس اس بات سے بھی ہوا کہ سید تراب علی نہ چاہتے ہوئے بھی مکان کے الاٹمنٹ کے انتظار میں دھوپ کی شدید تمازت حبس اور گھٹن برداشت کر رہے تھے۔ اس دن گرمی بھی غضب کی پڑ رہی تھی جیسے جہنم کا منہ کھل گیا ہو۔ سورج اتر کر سر پر کھڑا تھا ہربن مو سے پسینے کے قطرے تڑا تڑ بہہ رہے تھے۔ حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے اور گلا خشک ہو کر سوکھا چمڑا بن گیا تھا۔ تراب علی نے پہلی بار شیروانی کے سارے بٹن کھول دیئے تھے اور آنکھوں کے اوپر ہاتھوں کا چھجہ بنا کر بت بن گئے تھے۔ خاموش گم سم۔ وہ ایک ایسی قیامت کی آزمائشوں سے گزر رہے تھے جس کے خاتمے کے بعد ان کو راحت کی تمنا بھی نہ تھی بس وہ لوگوں سے الگ تھلگ، اکیلے اکیلے بڑبڑائے جا رہے تھے۔

"ایسا ہونا نہیں چاہئے تھا۔ زمین بھی چھوڑنے کی چیز ہے"۔

نئی بستی میں ہم دونوں اکٹھے ہی پہنچے۔ گوٹھوں کے درمیان چلنے والی وہ ایک انتہائی کھٹارہ بس تھی۔ ہچکولے کھاتی اور اپنے پیچھے دھویں اور گرد کا طوفان چھوڑتی منزل بہ منزل آگے بڑھتی رہی۔ ایک طویل صحرا اور بعد ازاں جنگلی کیکٹس اور کیکروں سے گھرے ہوئے طویل میدانوں کو عبور کر کے اس جگہ پہنچے جو ہماری نئی بستی تھی اور جہاں ہماری رہائش کے لئے قطار در قطار کوارٹر بنائے گئے تھے۔ مکان۔ دراصل میں تراب علی کا پہلے بھی پڑوسی تھا اور نئی بستی میں بھی ہمارے کوارٹر ساتھ ساتھ الاٹ ہوئے تھے۔ ان کے اور میرے کوارٹر کے درمیان بس ایک چادر برابر دیوار تھی۔ کسی نئی جگہ اچھا پڑوسی ڈھونڈنا بھی ایک مسئلہ ہوتا

ہے۔ کہتے ہیں اچھا پڑوسی اللہ کا انعام ہے اور تراب علی کی شکل میں مجھے یہ نعمت اس صورت میں حاصل تھی کہ میں ان کی باتوں کو چپکے سے سن لیتا' اور جہاں اس بات کا خطرہ ہوتا کہ میرے کسی قسم کے ریمارکس یا تبصرہ پر وہ خفگی کا اظہار کریں گے وہاں میں مصلحتاً چپ ہو جاتا وہ میری اس عادت سے خوب واقف تھے اور کبھی کبھی ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ کے ساتھ فرماتے۔

"یو آر کریزی ینگ بٹ اے گڈ لسنر۔ تھوڑا تھوڑا تمہیں پسند کرتا ہوں۔" شیروانی کا ایک آدھ بٹن کھلا ہوتا تو بند کر لیتے۔

انہوں نے اطراف پر ایک طویل گہری اور تنقیدی نگاہ ڈالی۔ ان کے کتابی چہرے' روشن آنکھوں اور کشادہ پیشانی پر غم واندوہ کے نقوش پوری طرح ابھر آئے تھے۔ انہوں نے ہم سے یا کسی سے اپنے اندر کی تیکھی' کڑوی' کسیلی باتیں کبھی نہ چھپائیں۔ کہتے۔ "ریاکاری آدمی کو اندر اندر بھسم کر ڈالتی ہے خود کو کبھی چھپانے یا ڈھکنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ بس تم دیکھو' مجھے پرانا والا مکان چھوڑنے کا بڑا غم ہے جس کا تم سب کے سامنے برملا اظہار کرتا ہوں۔ اب تم لوگ میری صاف گوئی سے برا مان جاؤ تو بھلا اس میں میرا کیا قصور ہے یہ تو اپنا اپنا انداز فکر ہے میرے نزدیک کسی پر اپنی رائے مسلط کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔"

انہوں نے اس لق ودق ریگ زار پر نگاہ ڈالی اور وہیں ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح دھپ سے زمین پر بیٹھ گئے۔ وہ بار بار اس علاقے کو صحرا کا نام دیتے کیونکہ جہاں برگ وبار۔ آب وگیاہ اور درختوں کے جھنڈ نہ ہوں۔ ان کے نزدیک وہ علاقہ بنجر' بانجھ' ریت کا تودہ اور جلتے ہوئے سورج کے نیچے ایک ایسا ریگستان ہے جہاں انسانی قافلے بھٹک کر پیاس سے دم توڑ دیتے ہیں۔ انہوں نے بڑے تاسف سے کہا۔

"تو گویا ہمارے لئے یہ ریگستان منتخب کیا گیا ہے۔"

میں نے دلیل دی "ابتدا میں ہر بستی کی شکل کچھ ایسی ہی ہوتی ہے۔ سید صاحب بستیاں اور کالونیاں تو بنتے بنتے اور بستے بستے بستی ہیں"۔ انہوں نے مجھے شعلہ بار نگاہوں کی انی پر چڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ریت کے ڈھیر ہیں جہاں نہ درخت ہیں اور نہ ٹھنڈے پانی کا ذخیرہ کیا یہ اصطبل جیسے

کوارٹر ہمارے گھر بن سکتے ہیں "؟ وہ کچھ دیر خاموش زمین پر انگلیاں پھیرتے رہے۔ اچانک انہوں نے مٹھی بھر ریت اٹھائی اور اسے اچھالتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں اس ریت میں مٹی کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ وہی خوشبو' سوندھی سوندھی' جسم و جاں کو تر و تازہ کرنے والی خوشبو اس مٹی اور اس مٹی میں کتنا فرق ہے۔" ان کے لہجے میں جو کرب اور دکھ تھا اس کو شاید میں نے پہلی بار اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا۔ میں نے ان کے جذباتی دکھ کے بوجھ کو ہلکا کرتے ہوئے کہا۔

"جو کچھ بھی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ ہمارے پاس اس کا کوئی متبادل بھی تو نہیں ہے۔ چل کر اندر سے کوارٹر ہی دیکھ ڈالیں۔ شائد یہ کوارٹر مکان یا جو کچھ بھی ہے کبھی ہمارے گھر بن جائیں۔"

"تم بھی ٹھیک ہی کہتے ہو' مجبوری ہے۔ مگر یہ مٹی جس میں ریت ہی ریت ہے' بجری ہے کنکر اور پتھر ہیں اور جس میں خوشبو کا نام و نشان نہیں بھلا وہ مٹی کیسے بنے گی۔ بولو مجھے بتاؤ' کچھ تو کہو ؟"

اس کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ اس لئے چپکا ہی رہا۔

ایک ہفتہ کی مسلسل بھاگ دوڑ کے بعد پرانی بستی کے ہزاروں مکین ! بسی بسائی بستی چھوڑ کر چٹیل میدان' دور دور تک کانٹے دار کیکروں کے جھنڈ کے درمیان ایستادہ کوارٹروں میں منتقل ہو گئے۔ ہمارے ایک پڑوسی قریشی صاحب نے ان کوارٹروں کو دیکھ کر تبصرہ کیا۔ "بھائی یہ انسانوں کے رہنے کے کوارٹر ہیں یا گھوڑوں کے اصطبل۔" سامان کی نقل و حمل اور ترسیل میں اونٹ گاڑیوں اور ٹرکوں نے جو لوٹ مار مچائی وہ ایک الگ داستان ہے۔ شام کی معدوم ہوتی ہوئی روشنی میں ہم اپنے اپنے الاٹ شدہ کوارٹروں میں اس طرح داخل ہوئے جیسے ان کی پیشانیوں پر لکھا ہو۔ "یہاں انسانوں کا داخلہ ممنوع ہے"۔

سید تراب علی بھی تھکے ماندے' نڈھال' افسردہ' اپنی ضعیف' بہت بیاری اور دائم المریض والدہ کے ساتھ اپنے نام کے کوارٹر میں منتقل ہو گئے۔ ان کے ساتھ ان کی ایک بیوہ بہن بھی تھیں شادی کے چند سال بعد ہی سہاگ کی چوڑیاں توڑ کر بیوگی کا بوجھ سمیٹے ان کے پاس ہی چلی آئیں۔ دنیا میں تراب علی کے سوا ان کا تھا ہی کون ؟ کوئی آل اولاد نہ تھی۔ بھائی

سے بڑی تھیں، بس ہر وقت ان پر صدقہ واری جاتیں۔ ادھر تراب علی کی ساری محبتیں اور دلچسپیاں، فرشتوں جیسی صورت والی والدہ ماجدہ کی ذات سے بندھی رہتیں ایک ذرا چھینک آتی اور وہ ان کی کھٹیا کے گرد چکر پر چکر کاٹنے لگتے۔

کچھ دنوں تک بستی پر موت کا سکوت چھایا رہا۔ سر شام مغرب میں پہاڑیوں کے عقب میں سورج غروب ہوتا تو پورے علاقہ پر گہرا سناٹا سنسنانے لگتا۔ چوری چکاری اور سانپ بچھوؤں کا خوف الگ ڈراتا رہتا۔ نہ کہیں بیٹھک، نہ ہوٹل اور نہ گھومنے پھرنے والے بازار اور مارکیٹیں۔ تراب علی بھی معمول اور روایات کے سارے کام بھلا بیٹھے تھے۔ کبھی رات کے دوسرے پہر ان کے گھر کے آنگن سے ناد علی کی پر سوز آواز آتی تھی۔ پھر سونے سے پہلے وہ بڑی باقاعدگی سے آیت الکرسی پڑھتے اور زور زور سے تالیاں بجاکر اَن دیکھی بلاؤں کے خلاف حصار قائم کرتے۔ اس زمانے میں مجھے اکثر آواز دیتے۔ "کیا ابھی سے سو گئے میاں۔ کچھ دیر جاگ لیا کرو، سونا تو قیامت تک کے لئے ہے"۔

لیکن اب جو ان کے رویے میں سرد مہری اور لاتعلقی آئی تھی اور اس کے ساتھ ان کے کوارٹر پر ہر وقت مردنی اور اداسی چھائی رہتی وہ ختم ہونے کا نام نہ لیتی۔ اس پر میں ہی نہیں ہمارے بلاک کے سارے مکین افسردہ اور ملول نظر آتے۔ سید تراب علی ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے دوستوں اور پڑوسیوں کو ہر معاملے میں مفید اور محتاط مشورے دیتے تھے۔ اقامت کی کچھ مدت تو لاتعلقی کی اسی کیفیت میں گذر گئی یا گذار دی گئی۔ پھر رفتہ رفتہ انسانی تقاضوں اور سماجی ضرورتوں سے مجبور ہو کر زندگی کے معمولات، محدود سہی بحال ہو گئے۔ پان اور سگریٹوں کے کیبن بن گئے۔ بیکری اور کریانے کی چند دکانیں بھی کھل گئیں۔ سرکنڈوں، کھمبوں اور بانس کی بلیوں کے سہارے ایک ہوٹل بھی کھل گیا۔ جہاں اب شام کے وقت لوگ جمع ہونے لگے تھے بڑے سے ساوار میں ہر وقت کڑک چائے کھولتی رہتی۔

زندگی کے معمولات میں ان تبدیلیوں کو سبھی نے محسوس کیا۔ اگر کسی نے محسوس نہ کیا اور ان تبدیلیوں کا کسی پر کوئی اثر نہ ہوا تو وہ تراب علی تھے۔ وہ مکمل آئی سولیشن میں تھے اور اس سے باہر نکلنے پر بالکل تیار نہ تھے۔ اور کبھی کھینچ کھانچ کر انہیں باہر نکالا جاتا اور کسی مسئلہ پر ان کی رائے طلب کی جاتی تو وہ بس ہوں ہاں کر کے ٹال جاتے۔ اگر کچھ زیادہ کریدا جاتا تو

بڑی مایوسی سے کہتے۔ "میاں اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے دو چار دنوں کی زندگی ہے ' بے بولتے در و دیوار کے درمیان کٹ ہی جائے گی۔ جس مٹی میں خوشبو نہ ہو بھلا اس سے لو لگانا کیا۔"

ادھر وہ کچھ دنوں سے زیادہ مایوس اور پریشان رہنے لگے تھے۔ ان کی والدہ کی حالت اچانک بگڑ گئی تھی۔ دوا دارو کے علاوہ گڑگڑا گڑگڑا کر والدہ کی صحت یابی کی دعا مانگتے اور شب و روز ان کی تیمارداری میں جتے رہتے۔

ایک دن اچانک رات کے پچھلے پہر میری آنکھ کھل گئی۔ تراب علی زور زور سے ناد علی پڑھ رہے تھے۔ یہ تبدیلی خوشگوار ضرور تھی مگر ہمارے نزدیک حیرت انگیز تھی۔ وہ تو یہاں آکر ایسے چپ ہوئے تھے جیسے بولنا بھول گئے ہوں میں اپنی چارپائی پر لیٹا اس تبدیلی پر ابھی غور ہی کر رہا تھا کہ ان کے کوارٹر سے آہوں اور آنسوؤں میں ڈوبی سورہ یٰسین کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز بھی تراب علی ہی کی تھی مجھے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو ' اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ان کے کوارٹر کے دروازے پر دیر تک آواز دی تو وہ عجیب عالم میں باہر برآمد ہوئے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں کے سارے چراغ بجھ کر دھواں دے رہے تھے۔ بمشکل کہہ پائے۔

"والدہ صاحبہ" تراب علی بڑی بڑی سختیوں اور آزمائشوں میں ثابت قدم رہنے والے ' چٹان کی طرح ٹھوس اور غیر متزلزل ' میرے کندھے پر سر رکھ کر چھوٹے بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگے۔

"سب کچھ ختم ہو گیا۔ میاں اب تو میرے پاس کچھ نہ رہا"۔

وہ روزانہ صبح تڑکے اور شام کے جھٹپٹے میں اپنی والدہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے جاتے۔ یہ ان کی زندگی کا معمول بن گیا تھا۔ قبر پر پہنچ کر موم بتی روشن کرتے۔ اگر بتی سلگاتے اور لوبان کے ہلکے ہلکے دھوئیں میں فاتحہ خوانی کرتے۔ واپسی میں بانسوں ' کھمبوں اور چٹائیوں سے تعمیر کیئے ہوئے بھیا خان کے ہوٹل کے تھڑے پر بھی کچھ دیر کے لئے بیٹھ جاتے جو بتدریج اس علاقے کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ علاقے کے سارے سیاسی "کیکر" اور تڑی باز یہاں بساط بھر اپنی معلومات کا خزانہ لٹاتے۔ کسی کے وہم و گمان میں

بھی یہ بات نہ ہوگی کہ سید تراب علی جو کسی قیمت پر یہاں آنے کے روادار نہ تھے۔ بھیا خان کے ہوٹل میں بیٹھنے لگیں گے۔ یہی نہیں بلکہ علاقہ کے بعض مسائل پر مشورے بھی دینے لگے تھے۔ ان میں اچانک یہ تبدیلی کیسے پیدا ہوئی اس بارے میں کوئی کچھ نہ جانتا۔ ہر شخص لاعلم اور مکمل اندھیرے میں تھا۔ کسی نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ ان کے رویے میں یہ تبدیلی کیسے پیدا ہوئی۔ بس اتنا کافی تھا کہ والدہ کے انتقال کے کچھ دنوں بعد وہ کسی قدر زندہ اور متحرک بن گئے تھے۔

ایک دن وہ صبح سویرے قبرستان جا رہے تھے۔ شاید چھٹی کا دن تھا۔ راستے میں مجھ سے ملاقات ہوگئی۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ قبرستان کے لئے ابھی باقاعدہ جگہ الاٹ نہیں ہوئی تھی۔ لق و دق، وسیع میدان میں نہ آدم نہ آدم زاد۔ ہو کا عالم تھا پورے میدان میں صرف ان کی والدہ کی ایک اکیلی قبر تھی۔ بڑا عجیب اور سوگوار منظر تھا۔ وسیع، ویران، شجر سایہ دار سے خالی البتہ یہ دیکھ کر ضرور خوشی ہوئی کہ تراب علی کی والدہ کی قبر کے سرہانے ایک چھوٹا سا ہرا بھرا درخت اگ آیا تھا۔ جس کے سبز سبز پتوں اور نازک کونپلوں پر سید تراب علی نے بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "یہ چھوٹا سا درخت میری والدہ کی قبر پر ہروقت سایہ کیے رہتا ہے"۔

انہوں نے حسب معمول اگربتی جلائی، فاتحہ پڑھی اور قبر کے سرہانے اکڑوں بیٹھ کر کچھ دیر کے لئے مراقبہ میں چلے گئے۔ پھر مجھے اپنے قریب بلایا۔ اپنی والدہ کی قبر سے مٹھی بھر مٹی اٹھائی اور میری مٹھی میں دیتے ہوئے بولے۔

"میاں ذرا سونگھو تو سہی اس میں وہاں کی مٹی کی خوشبو تو نہیں آ رہی"؟

(گردآلود شام)

۱۹۸۸ء

مصنف کی دیگر تصانیف

- سوا نیزے کا سورج
- گردِ آلود شام
- ٹھہرا ہوا سورج

پچھلے بیس پچیس برس میں جو افسانہ نگار ابھر کر سامنے آئے ہیں ان میں نعیم آروی کا نام بہت نمایاں ہے آج وہ اردو کے ایک جانے پہچانے اور مستند افسانہ نگار ہیں۔ یہ مقام انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت اور سالہا سال کی ریاضت سے حاصل کیا ہے ان کا تعلق بنیادی طور پر سماجی حقیقت نگاری کے دبستاں سے ہے ہرچند کہ یہ حقیقت نگاری پریم چند، کرشن چندر، منٹو اور عصمت چغتائی کے فکر و فن کا تسلسل ہے مگر موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے بہت مختلف ہے انسانی معاشرہ مسلسل تبدیل ہوتا رہا ہے اور تبدیلی کے اس عمل میں نت نئے روپ اختیار کرتا رہتا ہے پرانی اقدار اور روایات کی شکست و ریخت ہوتی ہے اور من کے نتیجے میں نئے افکار اور خیالات جنم لیتے ہیں چنانچہ حقیقت نگاری کا تصور بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے نعیم آروی کے افسانوں میں یہ تبدیلی، یہ نئی حقیقت نگاری صاف نظر آتی ہے۔

ان کے افسانوں کے تین مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں "بستی کا آخری آدمی" ان کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ ہے اس کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ نعیم آروی کا ادبی سفر فکر و فن کی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے اور آگے بڑھ رہا ہے موضوع میں تنوع کے ساتھ ساتھ ان کی تحریر میں نئی شگفتگی اور رعنائی پیدا ہو گئی ہے الفاظ کی نشست و برخاست جملوں کا دروبست کبھی کبھی رمز و کنایہ میں بات کہنے کا ہنر اور مانوس اور برمحل علامتوں کا استعمال، ایسی امتیازی خوبیاں ہیں جو انہیں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔

شوکت صدیقی

۲ فروری ۱۹۹۱ ع